مثنوی

فرّخ نامه

[The Book of the Blessed]

احوالِ سیّاحت رہ نورد در عالمِ علوی

به عنوان وادیٔ ظلال، برزخِ امثال و فردوسِ جمال

به رهنمائیِ زنده رود

سرودۂ:

دکتر اسلم انصاری

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر
پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
حکومت پاکستان
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 36314510, 99203573
Fax: [+92-42] 36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-559-2

طبع اول	:	۲۰۲۱ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۴۵۰ روپے
مطبع	:	فرید یہ آرٹ پریس انٹرنیشنل، لاہور

محلِ فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۳۷۳۵۷۲۱۴

فهرست مضامینِ فرخنامه

1۔ ره‌نوردِ شوق اور فرخ نامہ (دیباچہ) ..... ڈاکٹر بصیرہ عنبرین 9

2۔ عرضِ مصنف 40

3۔ حرفِ آغاز 47

4۔ حدیثِ خواب: عصرِ پائیزی و ماجرای شگفت آور 50

5۔ مناجاتِ ره نورد 50

6۔ پیکرِ زنده رود ظاهر می شود 51

7۔ تجلیلِ زنده رود از ره نورد 51

8۔ خطابِ زنده رود با ره نورد: زنده رود رهبرئ ره نورد را بعهدهٔ خود میگیرد 52

بخشِ اول: وادئ ظلال (The Valley of Shadows)

9۔ دشتِ زرد 60

10۔ خارستان 62

11۔ روحِ بودا آشکارا می شود و اندیشهٔ خود را که مربوط به فضائلِ هشت گانه می باشد، ابراز میکند 65

12۔ حرکت بسویِ راهِ وادی نما و کوه پایه 66

13۔ درپسِ کوهسار و قلزمِ خونین 68

14- نوحۀ الهٰی بخش غدار بر حالِ خویش 70
15- ساحلِ گرمِ ریگ 71
16- منطقۀ أتشین: آتشِ سرخ گون 72
17- آتشِ نیلگون 75
18- آتشِ سپید 76
19- آتشِ زمهریر 77
20- عذابِ مردمانیکه اولادِ کسان را با مکر و حیله از ایشان جدا میکردند 78
21- عذابِ قاضیانِ بیداد گر 79

بخشِ دوم: برزخِ امثال (The Purgatory of Forms)

منطقۀ کیفر و امید 83
22- منظره ای سنگلاخی و مردمانِ سنگین لباس
کیفرِ کسانی که راهِ مردمان بستند 84
23- الم کدۀ فراق و هجران زدگی،
سیفو شاعرۀ یونانی در عالمِ فراق از دخترانِ جزیرۀ لیسباس 85
24- باغِ ویرانِ زنِ زیبای از دیارِ هند 88
25- حکایتِ آن زنِ هندی 89
26- پرتوستان: منطقۀ آخرینِ برزخِ امثال که از انوارِ حقائق و افکارِ
متفکرین و نویسندگانِ جهانی روشن است 92
27- منطقۀ ای که قرینِ باغ جاودان است و مقامِ مردمانِ خوش بین و حقیقت شناس

که امیدوارِ پرتوِ جمالِ خداوندی هستند 93
28- منتظرانِ پرتوِ جمال 93
29- شیکسپیئر و محاورهٔ بین او و ره نورد 94
30- ایمرسن، متفکرِ امریکائی بسخن در می آید 96
31- کانت، فیلسوفِ آلمانی
نیطشه، شاعر و حکیمِ آلمانی 96
32- جهانِ نو 97
33- برگسان: مفکرِ فرانسوی که زمان را سرِّ حیات و اصل موجودات قرار داد
و وجدان را از عقل برتر گردانید 97
34- گوته، شاعرِ المانوی 98
35- بازگوئی کردنِ گوته در مدحِ نیطشه بحضورِ حافظِ شیراز 99

بخشِ سوم- بهشتِ جمال (THe Paradiso of Beauty)

36- ساحلِ گلفرش و آغازِ سفر سوی بهشتِ جمال 104
37- دروازهٔ زرّین و در پسِ آن دروازه 105
38- مقاماتِ مردمان دائم الحال: جای مردمانی که درحالت ها خوشنود اند
که در عالم آب و گِل خوششان می آمد 106
39- نموداری فیلسوفِ اندلسی ابنِ رشد 106
40- ابن رشد درمدح عقل ودانش 107

41۔ مقام شیخِ اشراق: شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول 108
42۔ مقام خطیبِ لبیب: کہ آزادی خواہ کشوراز دست استعمار انگلیسیان بود 109
43۔ خطیبِ لبیب درسخن درمی آید 110
44۔ مقام رہبرِ معظم : بنیان گذارِ کشورِ پاک1947ء 111
45۔ رہبرمعظم مخاطب بہ زندہ رود ترانہ سنج می شود 111
46۔ حرکت بسوی فردوسِ شاہان دادگستر ودانشمندان وہنروران نامی وخوش نگر 112
47۔ دیدار با نوشیروان عادل و دستور او بزرگ مہر 113
48۔ خطاب رہنورد با نوشین روان 113
49۔ فردوس شہیدان درالماس پایہ ودیدار بامظفر خان شہید درماہ پایہ 115
50۔ کاخ فردوسی طوسی 117
51۔ کاخ و بستان شاعر شرق گرای المانوی گوتہ (از حیثِ پیکرِ مثالی) 118
52۔ فردوس مصور مشرق 120
53۔ کاخ مصور مشرق 121
54۔ کاخِ معمارِ تاج : نادرالعصر استاد احمد لاہوری معمار شاہجہانی 122
55۔ روح میرزابیدل نمودارمی شود 124
56۔ میرزا بیدل غزل می سراید 125
57۔ کاخ مرزا غالب دہلوی 127
58۔ چراغِ مقبلی 128
59۔ دریای نور 129

60- کاخ گل نشان و دختر ماه وش 131
61- گفتار زنده رود 132
62- دیدار با سعدی شیرازی درباغ دانش 132
63- چند پند از سعدی 133
64- پیش ما آمد جهان نوپدید 134
65- ترانهٔ بلبل شیراز حافظ شیرازی 134
66- حافظ شیراز درجذب و مستی میگوید 136
67- گفتار زنده رود 136
68- دفعهً آن وادی ای آمد پدید 137
69- دعای رومی برای سعادت بشر بر زمین 139
70 - رهنورد 139

(دیباچہ)

رہ نوردِ شوق اور فرخ نامہ

فرخ نامہ ممتاز معلم ومفکر، محقق و مدون، نقد نگار و اقبال شناس اور صاحبِ طرز شاعر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری کی تازہ ترین فارسی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ایک طرف انصاری صاحب کے ادبیاتِ شرق وغرب کے گہرے مطالعات کا نتیجہ ہے تو دوسری جانب شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی شہرہ آفاق تصنیف جاوید نامہ کے رنگ وآہنگ میں مرقوم ایک متاثر کن تجربہ۔ باطنی طور پر سیرِ افلاک پر مبنی ادبیات کی روایات سے انسلاک کے باوجود یہ شاعر کے انفرادی و ذاتی طرزِ احساس کا ایک ایسا شاہ کار ہے جو نہ صرف کلاسیکی ادبی روایت کی جاگیر میں اضافے کا باعث بنا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ وہ کلامِ خوش آہنگ ہے جو اخلاقیات کے روشن تر نکات کو از سرِ نو اذہان وقلوب میں تازہ کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ مثنوی ایک ایسے مکالماتی وڈرامائی منظومے کے طور پر پیش ہے جس کا منظر نامہ تخیلاتی ہے۔ مثنوی کا بنیادی کردار 'رہ نورد' کا ہے، جو خود شاعر ہے اور عالم علوی کی سیاحت کا احوال سنا رہا ہے جو وادیِ ظلال، برزخِ امثال اور فردوسِ جمال کی سیر پر مبنی ہے۔ ذہنی وخیالی طور پر انجام پانے والا یہ سفر علامہ اقبال کے تخیلی کردار ''زندہ رود'' کی معیت میں ہے جنھوں نے جاوید نامہ کی فلکی تمثیل میں سیر فلک کی روایت کو اوجِ کمال سے ہم کنار کیا۔ اقبال کا کلام حرکت وحرارت کا استعارہ ہے اور اس مناسبت سے علامہ کے کردار کو بطور رہبر مثنوی میں لانا نہ صرف ان کے شعری مرتبے کی تحسین ہے بلکہ تفکر وتفلسف کے مباحث کو اس انداز شعری میں بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ہادی و رہبر نہ ہوسکتا تھا۔ 'زندہ رود' کا کردار اقبال کی پیش کردہ اُس شعری روایت کی تجدید بھی ہے جس کے تحت انھوں نے مرشد رومی کی ہمراہی میں سیر افلاک کی روداد تخیلاتی ومفکرانہ رنگ وآہنگ میں پیش کی۔ تاہم فرخ نامہ کا موضوعاتی اختلاف، اس مثنوی کی ایک مختلف منظر نامے میں تشکیل اور مختلف نوعیت کے شعری کرداروں کی شمولیت تقلیدِ محض کے بجائے شاعر کی تازہ کاری کا ثبوت ہے اور یقیناً یہ فکرِ اقبال کا فیضان ہے جسے خود علامہ کے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

معراج وسدرۃ المنتہیٰ کی معنویت سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے کیوں کہ انصاری صاحب کی اس مثنوی کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صوفیانہ و عارفانہ روایات کی تحقیقی پیش کش کرنے کے ساتھ ساتھ شعری وفنی سطح پر بھی ان سے قریب تر ہیں۔ مزید براں علامہ اقبال کا جاوید نامہ جس کے تحت شاعر مشرق نے تصوراتی طور پر فلکی سیاحت کی اور فلسفیانہ ومفکرانہ تعبیرات تاریخی اشخاص اور وقائع کی وساطت سے پیش کرتے ہوئے ایک تحرک وحرارت سے بھرپور تصورِ زیست کی نمایندگی کی، علامہ کی پیش کردہ اس مستحکم روایت کے بھی اسلم انصاری نہ صرف امین ٹھہرے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے پُرتاثیر قلم سے اس میں نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔

فرخ نامہ میں رہ نوردشوق نے اپنی منازل عشق فلسفۂ شوق کے سالار علامہ اقبال (زندہ رود) کی معیت میں طے کی ہیں۔ اس مثنوی کو دوزخ، برزخ اور جنت کی مناسبت سے تین حصوں وادیِ ظلال، برزخ امثال اور بہشت جمال میں تقسیم کیا گیا ہے اور شاعر نے اپنے فلسفہ اخلاقیات کے متنوع زاویے مثالیہ رنگ میں پیش کر دیئے ہیں۔ فرخ نامہ کے ان تین حصوں سے قبل اسلم انصاری نے مثنوی کے روایتی انداز میں تمہیدی حصہ سپردِ قلم کیا ہے جو خالص شاعرانہ فضا رکھتا ہے اور رؤیائی رنگ میں مرقوم ہے۔ یہ حدیث خواب واحد متکلم کے صیغے میں پیش کی گئی ہے اور یہاں شاعر کا بیان کیفیاتِ باطنی کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کے تجربات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ چناں چہ ہم ایسے رہ نوردِ شوق سے آشنا ہوتے ہیں جو علم کے راستے پر رواں دواں ہے اور مشرق ومغرب کے افکارِ عالیہ سے کسب فیض کر رہا ہے۔ شعر گوئی، ارباب معنی کی صحبت اور فکر وآگہی کے بھرپور لمحات میں تشکیل پانے والا یہ کردار 'حرفِ اعتذار' کی صورت میں آغازِ داستان سے قبل مخاطب کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ اقبالؒ، بیدل اور غالب کی پیروی خوش کن میں اور مثنوی معنوی کے فیضان سے شعرِ عجم میں ایک تمثیل ڈھال رہا ہے جو کئی برسوں کی ریاضت اور کدوکاوش پر مبنی ہے۔ وہ اسے بارگاہِ ایزدی میں اسم محمد ﷺ (خاتم النبیین) کے ہمراہ قبولیت کے لیے یوں عاجزانہ پیش کرتا ہے:

کی توانستم بگویم این سخن — دستگیرم گشت لطف ذوالمنن
باز عودِ خویش را بنواختم — پس زیادِ دوست یاری خواستم
نغمہ را بیدار کردم از سکوت — المدد ای رب حیّ لایموت
باز خوانم نام محمودِ رسولؐ — نام اوبردن بود شرطِ قبول

معراج وسدرۃ المنتہیٰ کی معنویت سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے کیوں کہ انصاری صاحب کی اس مثنوی کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صوفیانہ و عارفانہ روایات کی تحقیقی پیش کش کرنے کے ساتھ ساتھ شعری و فنی سطح پر بھی ان سے قریب تر ہیں۔ مزید براں علامہ اقبال کا جاوید نامہ جس کے تحت شاعر مشرق نے تصوراتی طور پر فلکی سیاحت کی اور فلسفیانہ و مفکرانہ تعبیرات تاریخی اشخاص اور وقائع کی وساطت سے پیش کرتے ہوئے ایک تحرک و حرارت سے بھرپور تصورِ زیست کی نمایندگی کی۔ علامہ کی پیش کردہ اس مستحکم روایت کے بھی اسلم انصاری نہ صرف امین ٹھہرے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے پُرتاثیر قلم سے اس میں نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔

فرخ نامہ میں رہ نوردِ شوق نے اپنی منازل عشق فلسفۂ شوق کے سالار علامہ اقبال (زندہ رود) کی معیت میں طے کی ہیں۔ اس مثنوی کو دوزخ، برزخ اور جنت کی مناسبت سے تین حصوں وادیِ ظلال، برزخ امثال اور بہشت جمال میں تقسیم کیا گیا ہے اور شاعر نے اپنے فلسفہ اخلاقیات کے متنوع زاویے مثالیہ رنگ میں پیش کر دیئے ہیں۔ فرخ نامہ کے ان تین حصوں سے قبل اسلم انصاری نے مثنوی کے روایتی انداز میں تمہیدی حصہ سپردِ قلم کیا ہے جو خالص شاعرانہ فضا رکھتا ہے اور رؤیائی رنگ میں مرقوم ہے۔ یہ حدیث خواب واحد متکلم کے صیغے میں پیش کی گئی ہے اور یہاں شاعر کا بیان کیفیاتِ باطنی کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کے تجربات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ چناں چہ ہم ایسے رہ نوردِ شوق سے آشنا ہوتے ہیں جو علم کے راستے پر رواں دواں ہے اور مشرق و مغرب کے افکارِ عالیہ سے کسب فیض کر رہا ہے۔ شعر گوئی، ارباب معنی کی صحبت اور فکر و آگہی کے بھرپور لمحات میں تشکیل پانے والا یہ کردار 'حرفِ اعتذار' کی صورت میں آغازِ داستان سے قبل مخاطب کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ اقبالؒ، بیدل اور غالب کی پیروی خوش کن میں اور مثنوی معنوی کے فیضان سے شعر عجم میں ایک تمثیل ڈھال رہا ہے جو کئی برسوں کی ریاضت اور کد و کاوش پر مبنی ہے۔ وہ اسے بارگاہِ ایزدی میں اسم محمد ﷺ (خاتم النبیین) کے ہمراہ قبولیت کے لیے یوں عاجزانہ پیش کرتا ہے:

کی توانستم بگویم این سخن — دستگیرم گشت لطف ذوالمنن

باز عودِ خویش را بنواختم — پس زیادِ دوست یاری خواستم

نغمہ را بیدار کردم از سکوت — المدد ای رب حیّ لایموت

باز خوانم نام محمودِ رسولؐ — نام اوبردن بود شرطِ قبول

هر که خاکِ پای آن سردار نیست　　نزدِ ماجز سنگ و خاک و خار نیست
شمعِ هستی را فروغ از نورِ او　　آنکه رخشانَد جهانِ چار سو
"جمله عالم نسخه و دیباچه اوست　　جمله عالم بندگان و خواجه اوست"

اسی حصے میں شاعر خود کو حقیقی طور پر متعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ میں سرزمین ملتان سے متعلق ہوں جو عارفوں اور مقبولوں کا خطہ ہے۔ شعر وسخن اور علم وادب کا ذوق مجھے علم وآگہی کے راستے پر لے گیا۔ اس ذاتی نوعیت کی فضابندی کے دوران ہی قصۂ مثنوی شروع ہو جاتا ہے جسے شاعر نے 'حدیث خواب' کے زیرعنوان حالت خواب و بیداری کی منظرکشی کرتے ہوئے قلم بند کیا ہے۔ وہ حکایتی پیرایے میں گویا ہیں کہ خزاں رسیدہ عہد میں مجھ سے ماجرائے خوش کن سنیے کہ میں اس لمحے اپنے دل میں سیکڑوں خوں شدہ تمنائیں لیے خوف اور ناامیدی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ باہر کا منظرنامہ تو بے حد دل کش تھا لیکن مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ گلشن کا ہر ایک شاخ و برگ میرے لیے دشمنِ جاں ہے، اور سوائے موت کے کوئی میرا شہریار نہیں۔ ناخود آگاہی مجھے یہاں تک لے آئی کہ میرا وجود رہ نورد کے کردار میں ڈھل گیا اور پھر اس کی زبانی مناجات پیش ہوئی۔ انصاری صاحب نے داخلی واضطرابی کیفیت کو خارجی منظرنامے کے ساتھ ساتھ رہ نورد کی مناجات کی صورت میں کمال درجے کی شعری مہارت سے بیان کیا ہے۔ اولاً 'رہ نورد' کے گرد و پیش کی تمثالاتی فضائیں ملاحظہ کیجیے:

شامگاهان بود و ابر آلود بود　　نی مه و نی اخترك چهره نمود
لحظه لحظه تیرگی افزون شده　　آبجو پُرآب چون جیحون شده
پُر نهیب و پُرصدا و پُر گزند　　نخل ها چون کوهساران سر بلند
شاخه ها و برگ ها راهم ببست　　سوبسو دیدم که هر سو جنگل است
رفته رفته دورتر رفتم زجو　　سوی جنگل ناگهان آورده رو
شاخها با شاخها پیچیده سخت　　جنگلی انبوه و پُرخار و درخت
لرزه بر اندام بنده مو بمو　　صد صدای پُر نهیب از چار سو

نی کسی از حال من آگاہ بود　　نی مرا این سو نہ آن سو راہ بود

اس خواب ناک فضا میں رہ نورد کی زبانی یہ مناجات پیش ہوتی ہے: اے نظم آفرینِ کائنات میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تو نے شش جہات میں سیکڑوں تجلیات چشم بینا کے لیے وا کر رکھی ہیں۔ اے حرف وتشبیہ وخیال سے ماوراذاتِ پاک، اے ذوقِ جمال کے بخشندہ، اے ایسی متاع کے خریدار جس کا کوئی خریدار نہ ہو۔ میں غم میں مبتلا ہوں، میری امداد اور دست گیری کر، میری رہ نمائی کر۔ اُسی لمحے ایک پیکر زندہ جنگل کی سمت سے ظاہر ہوتا ہے، جو درحقیقت آفتابِ شعروفرہنگ و ہنر ہے۔ وہ صاحب نظر شاعر معروف، اقبال ہے جو درحقیقت ماہتابِ تابندہ تر ہے۔ 'زندہ رود' (علامہ اقبال) کی تجلیل پر رہ نورد اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

ای فروغِ دیدۂ آزادگان　　بافر از تو ملتِ اسلامیان

ای شعورِ ما ز تو سرمایہ دار　　کس نیامد ھمچو تو در روزگار

گلخنِ مارا گلستان ساختی　　خاکِ مارا مطلعِ جان ساختی

خفتگان را بختِ بیدار آمدی　　مثلِ فصلِ گل بگلزار آمدی

فکرِ خود را خوان یغما ساختی　　ای خوش آن روزی کہ با ما ساختی

رھبر فرزانۂ ما آمدی　　مژدۂ نوروزِ فردا آمدی

رھنمای کاروانِ من توئی　　ھم درین رہ پاسبانِ من توئی

جواباً 'زندہ رود' پریشاں خاطر رہِ نوردِ شوق سے موانست کا عہد کرتا ہے اور اس رمز سے آشنا کرتا ہے کہ راستہ گم کرنے ہی میں زندگی کی معنویت پوشیدہ ہے اور جسے حقیقی معنوں میں راہ سمجھنا چاہیے وہی راستہ درحقیقت معنوی سفر کا آغاز ہے۔ اس موقعے پر زندہ رود کی زبانی جن خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ علامہ کے نظریۂ زیست کے عکاس ہیں۔ شعر دیکھیے جہاں 'زندہ رود' بے چین ومضطرب رہ نورد سے کہتا ہے کہ تو جس معنوی سفر کا مسافر ہے اس کے طور طریقے بہت مختلف ہیں:

آنچہ می بینی زذرّہ بیش نیست　　از محیطِ آب قطرہ بیش نیست

عالم ما گر بھارستان بود　　این ھمہ یك غنچۂ خندان بود

این سفر صد حکمتت ارزان کند　　بر تو کارِ زندگی آسان کند

این زمان و این مکانی دیگر است　　ساعتی اینجا جهانِ دیگراست

تو نمی دانی چه رنگست این جهان　　روزی این عالم قرونِ آنجهان

هرچه پیش آید اگرچه صورتست　　معنئ معنیست کاین صورت ببست"

یہ کہہ کر وہ حکیم پاک زاد رہ نورد کو اپنے ہمراہ لے لیتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے کہ آؤ ہمت کرو، ڈرو مت۔ حق تعالیٰ نے یہ زمین و آسمان تخلیق فرمائے ہیں اور اس دنیا کو خیر و شر کے درمیان رکھا ہے جہاں دشت و دریا اور باغ و راغ بھی ہیں اور سیکڑوں چاند، ستارے چراغوں کی طرح روشن ہیں۔ آگے بڑھو، ان کا مطالعہ و مشاہدہ کرو، تدبر و تفحص سے کام لو۔ رہبر کے یہ الفاظ سنتے ہی رہ نورد کیا دیکھتا ہے کہ تنگ و تاریک راستوں میں فراخی آجاتی ہے اور بظاہر جو راستہ کوہساروں کے مانند دشوار گذار معلوم ہوتا تھا اسی میں سے مزید راستے نکل رہے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر رہ نورد کا دل جب اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہونے لگا تو 'زندہ رود' نے کہا:

رهبرم گفت 'ای سفرناکرده دوست　　هرکجا بینی سروسامان اوست

دست هرنامحرم و نادان مگیر　　منزلِ دشوار را آسان بگیر'

یوں اس سفر معنوی کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس فلکی سفر کا پہلا پڑاؤ 'وادیِ ظلال' (The Valley of Shadows) ہے اور یہ عنوان عارفانہ روایت کے تحت فلسفیانہ سطح پر دوزخ کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ وادیِ ظلال وادیِ ظلمات کے کنارے دکھائی گئی ہے جو سیاہ اور زرد شعلوں سے بھرپور ہے اور عالم یہ ہے کہ کسی میں بھی اسے عبور کرنے کی ہمت نہیں۔ البتہ اس کے بیچوں بیچ ایک نیم اور روشن تنگ راستہ مسافروں کی رہ نمائی کر رہا ہے۔ رہ نورد 'زندہ رود' کی ہم راہی میں یہیں سے داخل ہوتا ہے۔ ہر طرف آگ اور دھوئیں کے بادل ہیں۔ اس تنگ راستے کے اوپر کی جانب ایک قلعہ ہے جس کا دروازہ سنگین اور قدیم ہے، نہ کوئی پاسبان نہ داروغہ، محض یہ عبارت تحریر ہے:

"بشنود هرکس که تا اینجا رسید

پاك شوید دل زهر نقش امید"

یعنی نقش اُمید کو مٹا کر ہی یہاں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ زندہ رود نے یہ دیکھ کر کہا: اے بیٹے! یہ سرتاسر مقامِ خوف ہے لیکن ہم پروردگار کی رحمت سے بہ حفاظت منزل تک پہنچ جائیں گے۔ چلو، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اندر جا کر

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ نشانِ زندگی سے یکسر خالی ہے۔ نہ برگ وثمر، نہ باغ وراغ اور نہ ہی دوزخ کا کوئی سراغ۔ رہ نوردریافت کرتا ہے کہ اے مرشد! یہ کیسی دوزخ ہے جس کے شعلے مفقود ہیں؟ رہبر جواباً کہتا ہے کہ اے جوانِ ہوش مند! ہر جہنم آگ سے بہرہ مند نہیں ہوتی اور ہر گناہ کا جداگانہ حساب کتاب اور عذاب ہوتا ہے۔ جب غم انسان کو بری تقدیر سے دوچار کرتا ہے تو اس میں جلنا بھی گویا عذاب ہی کی ایک صورت ہے۔ ہر بُرائی کی مختلف اذیت ہے اور ہر جہنم کی عقوبت الگ۔ یہاں پہلا گروہ دُنیا میں عاجلانہ اور بے عمل زندگی گزارنے والوں کا نظر آیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگی کے تمام امور پر ناپایداری اور نامحکمی کا جادو طاری رہا جس کے باعث یہاں وہ بے حاصلی سے ہم کنار ہوئے۔ اگر دنیا میں وہ مختلف امور کی انجام دہی میں صبر واستحکام سے کام لیتے تو آج یہاں نہ ہوتے۔ ''زندہ رود'' کی زبانی شعر دیکھیے:

از فسون عجلت و نا محکمی　　کارِ شان راحاصل این بی حاصلی

صبر و تمکین ازحق است ای ذوفنون　　کار نامحکم بود آخر زبون'

یہ وہ روشن پہلو نکتہ ہے جس کا تذکرہ کلامِ اقبال میں بھی کثرت سے ملتا ہے، مثلاً:

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

اس خطے کا دوسرا گروہ کم کوش لوگوں کا تھا جن کی آنکھیں خلا میں مرکوز تھیں اور وہ گویا قید بے زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ مٹی کے اجسام کی طرح ساکت وصامت تھے اور بظاہر حقیقی وواقعی انسان ہونے کے باوجود حرکت سے عاری۔ وہ اس قدر سست تھے کہ ان کی خفیف سی حرکت میں ماہ وسال لگتے۔ یہ سب اربابِ تعطیل وہ تھے جو دنیا میں جب کبھی کسی کام کے لیے مستعد ہوتے تو ہر صبح کہتے کہ شام کو کریں گے اور ہر شام یہ کہتے کہ صبح کرلیں گے اور اسی روز وشب میں ان کی زندگی گزر گئی:

هر سحر گفتند اینك می رویم　　شامگه گفتند فردا می کنیم

'روز و فردا' روزگارِ شان ببرد　　عمرِ شان از دستِ شان آسان ببرد'

یہاں بھی اقبال کا شعر یاد آتا ہے:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

جب رہبر اور رہ نورد دوسرے ٹھکانے کی طرف بڑھتے ہیں تو انھیں مزید تاریکی، تنہائی اور کم مائیگی کا سامنا ہے اور اس پُر مہیب فضا کو شاعر نے تاریکی کی تمثالوں سے بخوبی پیش کیا ہے۔ اسی لمحے اس ظلمت خانے میں شاعر کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ دوری یا ہجر بھی کسی دوزخ سے کم نہیں، مہجوری آتشِ سوزاں ہے اور اس کے مقابلے میں وصل گلزار اور فصل آتش وش ہے۔ حیف! یہاں صحبت یاراں نہیں۔ کاشکے ساقیِ شعلہ بدن اپنا چہرہ دکھائے اور فراقِ انجمن کو نیست و نابود کر دے۔ وہ دعا بھی کرتا ہے کہ اے چراغِ جاں، آ کر اپنا نور بکھیر دے اور میری آرزو کے شراروں سے سیکڑوں گل تراش دے۔

آگے ''دشت زرد'' ہے جہاں فضائے خنک کا سامنا ہے اور حالت یہ ہے کہ مارے وحشت کے تابِ رفتار چھن رہی ہے۔ یہاں ہر سُو خزاں ہے اور خوفِ مرگ طاری ہے۔ نہ کہیں آب گاہ، نہ آبجو، فقط درشت ریگ۔ یہاں فکر و آگہی کے لیے کوئی جگہ نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ یہاں دل کی صدا کا تخم ہی کاشت نہ ہوا تھا۔ یہیں شاعر کو صحرائی ریگ میں لپٹا ہوا ژولیدہ مو اور زرد رو شخص دکھائی دیتا ہے جو اپنا احوال سناتا ہے کہ دراصل دنیا میں وہ عالم دین تھا لیکن خوفِ خدا سے عاری تھا اور ساری زندگی اس نے فکر و فتنہ اور بغض و کینہ پیدا کر کے اپنی جیبیں سیم و زر سے بھریں۔ اس نے شرع کو بازیچہ اطفال بنا رکھا تھا اور دشمنانِ حق کے ساتھ جا ملا تھا۔ وہ ہرزہ سراؤں کا گویا مرشد تھا۔ عالم یہ تھا کہ اس نے ایک خوش نہاد اور صاحب کردار قلندر کو جو عارفانِ سرِّ دین کے گروہ سے تھا، حکمتِ شرع مبین کا نکتہ دان تھا اور جس نے درِ شاہ پر کبھی گردن نہ جھکائی، اپنے جھوٹے فتوے سے مار ڈالا:

این چنین گفت آن فقیهِ بی وقار　　بانگ بر زد وانگهان نالید زار

شعلهٔ بی نورِ او چو دود شد　　در فضای زردگون نابود شد

رہ نورد کا اگلا پڑاؤ ''خارستان'' ہے جو بظاہر باغ کے مانند تھا لیکن باغ و راغ کے آثار سے عاری۔ ہر سو کانٹے اور سامانِ موت۔ درختوں کی شاخیں تلواروں سے تیز تر اور کانٹے جنگلی درندوں سے بڑھ کر درندہ صفت۔ یہیں ایک

درخت رہ نورد سے گویا ہوتا ہے کہ اے جوانِ ہوش مند! اس محفلِ خار سے پھولوں کی طرح مت گزر۔ یہ بات سن کر رہ نورد اس ویرانۂ خونیں بہار میں بے اختیار رو پڑتا ہے اور درخت سے اس حالت کا سبب پوچھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو کانٹے کی طرح سخت مزاج ہوتے ہیں اور میں ہمیشہ خار ہی اُگاتا رہا۔ میں دوسروں کے زخموں پر نمک چھڑکنے والوں میں سے تھا۔ ہم وہ لوگ تھے جو لوگوں کی الواحِ دل پر خراشیں ڈالتے تھے۔ ہم اس قدر بدگو، بدشعار، عیب جو اور بدخو تھے کہ دنیا میں لوگوں کی ایذا رسانی کا باعث بنتے رہے اور آج ہم یہاں سراپا اذیت ہیں، خار خار، خونچکاں اور دل ریش تر ہیں۔ یہیں پر شاعر کو ایک نُور کا ہالہ جس کا ذکر اس نے ''روحِ بودا آشکارا می شود'' کے زیرِ عنوان کیا ہے جو 'کرِ ما' یعنی پیروانِ بودا کے اس عقیدے کی توضیح میں مرقوم ہے کہ انسان کا ہر نیا عمل پہلے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ روحِ بودا یہ کہتی ہے کہ اے زندوں کے سفیر! اس عالمِ عیان میں ادلے کا بدلہ ہے اور اعمال کا سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ جان لو کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہے اور موجِ تفکر کی جنبش بھی تو ایک عمل ہی ہے۔ ہمارے تخیل سے آباد ذہنوں میں جو تمثالیں تخلیق پاتی ہیں، وہ بھی اعمال ہی ہیں اور ہم سب اعمال کی ایک ایسی زنجیر کے اسیر ہیں جس کا ہر ایک حلقہ دراصل ہماری وہ تدبیر ہے جو کسی عمل کے لیے ہم کرتے ہیں۔ برسوں گزر گئے میں نے اس اصول کی تحفیظ میں حرفِ عمل کو اس قدر طول دے رکھا ہے۔ روح بودا مزید کہتی ہے کہ میں تمھیں اس مرگ زار سے نکال لوں گی، قدم بڑھاؤ کہ اگر یہ سمندر ہے تو پھر ساحل بھی بہت ہیں۔ اس کا 'شہود' اس دنیا کے غیب سے ہے۔ مسلسل عمل کا ثمر ضرور ملتا ہے۔ ہر غیب کی جیب نمود کے موتیوں سے بھرپور ہے اور یاد رکھو کانِ وجود بھی کیسے کی طرح موتیوں سے بھری رہتی ہے۔ اے عزیز! چند رمزیں مجھ سے سیکھ لو اور وہ یہ کہ اچھا سوچنا، سچ بولنا اور سچے اعمال انجام دینا دراصل حالت پناہ میں آنے کے مترادف ہے۔

آگے چل کر دونوں کو ایک وادی نما حصہ درپیش ہے۔ تاحدِ نظر پہاڑ ہیں اور اس وادی میں سیکڑوں کم لباس، بے حواس اور پُر ہراس لوگ جمع ہیں جن کا شمار کرنا محال ہے۔ یہ سب گریہ کناں ہیں اور حلقہ در حلقہ کسی بھنور کی طرح وفورِ اضطراب میں بھاگ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پہاڑوں کی اطراف رواں دواں تو ہیں لیکن کچھ ہی بلندی پر پہنچ پاتے ہیں کہ ان کے سروں پر پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے عبرت پکڑ رہا ہے۔ ہر ایک گروہ کی حالت ابتر ہے اور کہنا چاہیے کہ ان میں بے بصر لوگوں کا گروہ بدتر ہے۔ زندہ رود اپنی فراست سے رہ نورد کی بے چینی بھانپ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دیوانے وہ ہیں جو بے مقصد اور بے فائدہ زندگی گزار گئے۔ آگے بڑھو، ان سے منھ

پھیرنا ہی بہتر ہے کہ یہ جگہ ہر لحظہ تاریک تر ہو جائے گی۔ چلو، ہماری منزل پہاڑوں سے آگے ہے۔ یہ تکلیف دہ راستہ بھی مرشد کی ہم راہی میں طے پاتا ہے۔ یہاں کی وادیاں تنگ و تاریک تھیں اور جگہ جگہ بھیانک غار منھ کھولے ہوئے تھے۔ سامنے خون کا سمندر تھا اور سرخ آندھیاں دیکھنے والوں کے لیے حشر ساماں تھیں۔ اسی محیط بے کنار کے قریں سیر العباد کے مصنف سنائی غزنوی کی روح ایستادہ تھی جو اس معنوی سفر کے پُر پیچ راستے میں مسکرا کر کہہ رہی تھی: ''اے فرزند اُدھر دیکھو۔'' چناں چہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشتیِ سیمیں ساحل پر آ لگی ہے اور سنائی 'زندہ رود' سے کہہ رہے ہیں کہ اے پسر! حیران مت ہو، ہماری سواری آ پہنچی۔ وہ اُفتاں و خیزاں سوار ہوتے ہیں تو سنائی کی آواز سنائی دیتی ہے کہ ہمارا ناخدا اللہ ہے۔ بادِ صرصر سے رہ نورد کے اعصاب شکستہ ہیں، قلزم خونیں متلاطم ہے اور ہر لحہ اس کی لہروں میں سیکڑوں مگرمچھ اور سانپ اُبھرتے ہیں۔ اسی سمندر میں دو افراد دکھائی دیتے ہیں جو شدید پیچ و تاب میں غوطے کھاتے ہوئے کشتی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ کبھی سطح آب پر اُبھرتے تو کبھی گم ہو جاتے اور بالآخر مگرمچھوں کا لقمہ بننے کو تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں ہر سعی کرنے والا اپنے انجام سے دوچار ہو رہا تھا۔ زندہ رود شاعر کی رہ نمائی کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ان میں سے ایک لعین شخص الٰہی بخش ہے جو بہادر شاہ ظفر کا خادم تھا جس نے مکر و غداری سے بادشاہ کو انگریزوں کے حوالے کیا اور وہ رنگون جلاوطن ہو کر راہی ملک عدم ہوئے۔ دوسرا دگلس ہے جو انگریز گروہ کا سالار تھا اور سفا کی میں معروف۔ وہ تیموری مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا اور اس نے ان کا بے دردی سے قتل و خون کیا۔ اب یہ دونوں دائم دریائے خون میں غرق آب اور بے مرگ رواں ہیں۔ مثنوی میں اس مقام پر 'نوحۂ الٰہی بخش' رقم ہے جو اپنے دروغ اور حیلے پر ماتم کناں ہے اور یہ کردار فی الحقیقت غدار کے انجام کی تصویر دکھاتا ہے۔ آگے چل کر 'ساحل گرمِ ریگ' کا سامنا ہے جو دور سے دھویں کی لکیر معلوم ہو رہی تھی۔ صحرائی ہواؤں میں ساحلی پودے بے ثمر و بے گل تھے اور ان کی شاخیں کانٹوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ ہر سُو موت کا خوف تھا اور یہاں کم لباس، بے خود اور گریہ کناں عورتوں کا ایک بے قرار گروہ پُر خار شاخوں کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ زندہ رود وضاحت کرتا ہے کہ یہ فانی دنیا کی بے وفا، بے خود، بے اختیار اور بے خوف عورتیں ہیں جو اپنے حیلہ و مکر سے اپنے اپنے ہمسر کے بجائے دوسروں پر ملتفت رہیں اور عفت کے آب دار موتی لٹانے کے باعث اس خار زارِ بے اماں میں تا قیامت یونہی بھٹکتی رہیں گی۔ اسی جنگل کے کنارے ایک زرد و سبز شعلوں سے بھرپور ٹھکانے میں وہ لوگ موت کو ترس رہے تھے جو دنیا میں منکر، جھوٹے، راہزن، مفسد، واعظ، ناصح بے عمل اور پیران پُر دغل تھے اور دنیا میں ہمہ وقت فتنہ و فساد ہی پھیلاتے رہے۔

''منطقۂ آتشین'' کئی سو نوری سال کے فاصلے پر ہے لیکن اس وقت دونوں کو یہ عرصہ مختصر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تاحدِ نظر بھڑکتی ہوئی سہم ناک آگ ہے اور چاروں طرف الامان والحذر کی صدائیں اور اس آشوب آتشیں میں لپٹے ہوئے مرد اور عورتیں۔ ان ناصبور لوگوں کی آنکھیں، کان، ہاتھ اور منھ سلے ہوئے تھے۔ ہر جسم کا شعلہ یہی صدا دیتا تھا کہ میرے اعمال کا انجام بُرا ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو جھوٹ، مکر اور فتنہ وفساد کے حیلوں سے قوم وملت میں افتراق ڈالتے رہے اور ان کے فتنے جمعیتِ ملت کو پارہ پارہ کر گئے۔ یہیں ایک شخص آگ سے جھلس رہا تھا جس کے گلے، دامن، ہاتھ، پاؤں، چہرے اور زبان میں کانٹے دھنسے ہوئے تھے اور مارے درد کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو چکے تھے۔ رہ نورد کے استفسار پر زندہ رود بتاتا ہے کہ یہ سیاہ رو اور ہرزہ گو شخص دنیا میں ایک دل خراش شاعر ہوا کرتا تھا۔

''منطقۂ آتشین'' کا دوسرا حصہ ''آتشِ نیلگون'' ہے جو نہایت مہین اور تنگ وتاریک مقام ہے۔ یہ سرخ شعلوں کے عقب کی دنیا ہے جس کی جلن بھی زیادہ ہے۔ یہاں لوگ طوق اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے آبِ آتشیں کو بھی غنیمت سمجھتے ہوئے اس کے لیے ترس رہے ہیں لیکن اسے پینے پر ان کی حالت مزید بگڑ جاتی ہے۔ پانی کی ندیاں ان کے قریب آتی ہیں لیکن جونہی یہ پینے کو لپکتے ہیں تو یہ ریت اور آگ میں مبدل ہو جاتی ہیں۔ یہاں وہ کج نہاد لوگ جمع تھے جو دُنیا میں لوگوں کے درمیان فتنہ وفساد ڈالتے رہے:

درمیـــان جـنـگ از طبـعِ سـقیـم　　آب را بستـنـد ایشـان برغـنیـم!''

تیسرا حصہ ''آتشِ سپید'' کے زیرِ عنوان ہے جس کے شعلے بلند اور بظاہر نور اور کافور کے مانند سفید ہیں، لیکن فی الاصل نہایت تند و تیز ہیں اور ان کی تندی سے لوگ گھائل ہو رہے تھے۔ رہبر نے بتایا کہ یہ ناصحوں کا گروہ ہے جو یہاں سزا کاٹ رہا ہے:

الحذر زین تیره بختان ، الحذر　　الحذر زین حقه بازان ، الحذر''

آگے چل کر دونوں کو ''آتشِ زمہریر'' کا سامنا ہے جہاں سرد مزاج، بے مہر اور ظالم وسفاک لوگ سزا کاٹ رہے تھے۔ یہاں خنکی کے مارے خون رگوں میں جم رہا تھا اور ہڈیاں بادِ صرصر سے شکستہ ہو رہی تھیں۔ ہوا یخ بستہ تھی اور اس مرگ زا برف کے دریا میں لوگ فضا میں معلق تھے۔ خنک ہواؤں سے ان کے جسموں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا اور وہ موت کی حسرت کر رہے تھے۔ اس موقعے پر زندہ رود بتاتا ہے کہ یہ سرد مہر اور تند خو لوگ زر پرستوں میں سے تھے، انھوں نے ساری زندگی کسی کو نفع نہ دیا اور اب یہاں سزا بھگت رہے ہیں:

کس نبردہ سود ازین سنگین دلان　　صد جفا دیدند مردان زین کسان
اندرون شان سوز و دلگرمی نبود　　بر زبانشان گفتگو نرمی نبود
این همہ سردی ز دلسردیٔ شان　　یخ ببست و زمہریری شد ازان!''

اسی طرح مکر وحیلہ سے کام لینے والے بالخصوص اولاد اور والدین کے مابین جدائی ڈالنے والوں کی سزا کا منظر نامہ کوہِ گراں کے بیچوں بیچ یوں دکھایا گیا ہے:

گفت: 'اینہا مردمان پُر جفا　　از کسان اولادِ شان کردہ جدا
جائی دلہا پارہ سنگی داشتند　　دیدن بچگان نمی بگذاشتند
ہیچ اشکِ مادر و دردِ پدر　　با دلِ سنگین شان کردہ اثر
نی پذیرفتند زاری از کسی　　گرچہ می نالید پیش شان بسی
این ہمان باریست کہ دلہا فشرد　　ہریکی درحال سنگینی بمرد'

وادیِ جہنم کے سب سے آخری حصے میں شعلوں سے اٹا ہوا ایک جنگل دکھائی دیا جس کے درختوں کی ٹہنیاں تلوار کی سی کاٹ رکھتی تھیں اور درخت چھاؤں کی بجائے شعلے برسا رہے تھے۔ رہ نورد کے استفسار پر زندہ رود کہتا ہے کہ یہ ان قاضیانِ ناسزا کا مسکن ہے جنھوں نے لوگوں کو ناحق سزائیں دیں:

قاضیان غیر منصف را ببین　　سوختہ سامان و بس اندوھگین
در جہان تخمِ تظلم کاشتند　　عدل نی کردند و دعویٰ داشتند
بی گناہان را بدار آویختند　　کذب ہا با کذب ہا آمیختند
عدل را صدبار میکردند خون　　می شوند اینجا بصد خواری زبون

یوں اسلم انصاری نے اخلاقیات کے تناظر میں اس مثنوی میں جہنم کا ایسا عبرت اندوز نقشہ جمایا ہے کہ اسے پڑھ کر بانگِ درا کی نظم ''سیرِ فلک'' کا آخری حصہ یاد آجاتا ہے، جہاں علامہ نے تخیل کی ہم سفری میں سیرِ فلک دکھائی ہے۔ یہاں جب اقبال کا تخیلاتی سطح پر حلقۂ صبح وشام کے اس پُرانے نظام سے نکل کر آسمان پر گزر ہوتا ہے تو جہاں

ایک طرف اِرم کو ''خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش'' قرار دیتے ہیں، وہیں جنت سے ان کی نگاہ ٹھکانۂ جہنم پر پڑتی ہے، جس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

دُور جنت سے آنکھ نے دیکھا
ایک تاریک خانہ، سرد و خموش
طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ
اُس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خُنک ایسا کہ جس سے شرما کر
کُرۂ زمہریر ہو رُوپوش
مَیں نے پوچھی جو کیفیت اُس کی
حیرت انگیز تھا جوابِ سروش
یہ مقامِ خُنک جہنم ہے
نار سے، نُور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے
جن سے لرزاں ہیں مردِ عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

ڈاکٹر اسلم انصاری کا یہی استدلال ہے کہ اہل جہنم دنیائے فانی میں اپنی اخلاقی تنزلی کے باعث دنیائے باقی میں ایسے بھیانک عذاب کے سزاوار ٹھہرے اور اس نقطۂ نظر کو انھوں نے کمال درجے کی فکر انگیزی اور شعری پختگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

فرخ نامہ کا دوسرا حصہ ''برزخِ امثال'' یعنی (The Purgatory of Forms) کے زیرعنوان مرقوم ہے۔ اس کا آغاز کیفر و امید کے منطقے سے ہوتا ہے اور یہاں دنیا کے خطا کار کیفر کردار کو پہنچنے کے قریں ہیں۔ برزخ میں وہ پروردگار سے ملتجی ہیں کہ انھیں واصل جہنم نہ کیا جائے۔ اس حصے کا آغاز ساقیِ ازل کی مدح و ستائش سے کیا گیا ہے اور

شاعر یہاں ساقی نیکوصفات سے اپنی جانِ بے تاب کی تسکین کا خواہاں ہے، نیز وہ خمستانِ سخن سے ایک گھونٹ کا طلب گار بھی ہے۔ 'زندہ رود' اس کی کیفیات کو بھانپتے ہوئے اسے ممکناتِ زندگانی کے لامتناہی ہونے اور ہر مقام آخریں کو اوّلین سمجھتے ہوئے جہانِ دیگر کی تلاش میں منہمک رہنے کا سبق دیتا ہے۔ یہاں زندہ رود کی زبانی رقم کیے گئے شعر پارے اقبال کا رنگ لیے ہوئے ہیں، ملاحظہ کریں:

ای پسر حیران مشو در خود نگر — یك جهان باشد برایت منتظَر

دردلت صد بحر ها اندر خروش — درضمیرت صد جهان حیرت فروش

آتش و گل نغمه ای یك ساز جان — هرنفس پیدا کند صد راز جان

اینکه پیش تست برزخ نام اوست — وقفه ای بین دو حرفِ گفتگو ست

برزخ کا پہلا منظر ایک سنگلاخ مقام پر مبنی ہے جہاں سنگین لبادوں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ اپنی سزاؤں کے منتظر ہیں جن کا جرم لوگوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔ زندہ رود کہتا ہے کہ دیکھو جو دوسروں پر پتھر برساتے تھے، یہاں کس طرح خستہ و بے جان ہیں اور مسدود راستوں کو کھولنے میں مصروف کار ہیں۔ وہ زیرلب کچھ بڑبڑا رہے تھے اور انھیں اس کام سے مطلق فرصت نہ تھی۔ حالت یہ تھی:

سنگ دست و سنگ پا و سنگ رو — سنگ چشم و سنگ گوش و سنگ مو

سنگها بر سنگها می کوفتند — پیرهن از سنگها می دوختند

رہ نورد اپنے مرشد سے ماجرا دریافت کرتا ہے تو جواباً انہی میں سے ایک گویا ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی راہیں مسدود کرتے تھے چناں چہ دیکھو آج ہم سب پر راستے بند کر دیئے ہیں۔ وہ دونوں انھیں اس حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں تو آگے مزید دل خراش منظر نامہ درپیش ہے۔ یہ فراق کے ماروں کی ایک وادی ہے جو حزن واندوہ اور ملال ویاس سے بھرپور ہے۔ یہاں سبھی تشنہ لب ہیں لیکن پانی نایاب۔ چاروں طرف محض بے برگ و بار پودے ہیں وحشت کا عالم ہے اور ہر سُو فقط دھویں کے بادل:

گرم بود آن وادیٔ پُر احتراق — از فغانِ الفراق و الفراق

یہاں قدیم یونانی شاعرہ دکھائی دیتی ہے جو زندگی میں خوبصورت لڑکیوں کی عاشق تھی اور ان کے عشق میں

غزلیں کہا کرتی تھی۔ اس نے عین جوانی میں حالت عشق میں پہاڑ سے کود کر اپنی جان دے دی۔ یہاں وہ ایک بے نصیب قطعے پر بے صبری کی حالت میں براجمان تھی۔ یہ ماہ سیمیں پیکر اور خوش گل شاعرہ جس نے اپنی دل بری، عشوہ طرازی اور ساحری سے کئی عشقیہ نکات شعری قالب میں ڈھالے، جس کی ایک نگاہ سیکڑوں حیرتوں کے جادو لیے ہوئے تھی اور جس کی ہستی دنیا میں چمن عشرت فروش کا سماں پیدا کیے ہوئے تھی، یہاں وہ فراقِ دوستاں کی گلہ گزار تھی۔ پری، مہروش، گل بدن، زرینہ، سلیمیٰ، فریحہ، بہار وغیرہ سبھی کو یاد کر رہی تھی اور بار ہا پکار رہی تھی۔ یہ سب حسینائیں جو ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، اس کی کیفیت دیکھ کر جواباً کہہ رہی تھیں کہ ہم سب یہاں ہیں، آؤ ہماری محفل کو گرماؤ۔ جس پر یہ زنِ مہجوران کی طرف لپکی لیکن جونہی قریب ہوئی تو یہ گروہ دور تر ہو کر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اچانک خوش گوار ہوائیں چلنے لگیں اور برگ و بار دمکنے لگے اور اس موقعے پر یوں کلام کیا گیا ہے کہ اے شاعرہ! تو خوبرو تھی لیکن تیرا اس طرح دل کو گھلانا کارِ خوب نہ تھا۔ اپنی نفی کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ گویا ذوقِ سجود میں ہوس کو شامل کرنا ہے اور قلب و جان کی خطا کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد شاعر نے دیارِ ہند سے ایک اور خوبرو عورت کے ویران باغ کا منظر دکھایا ہے جو خزاں زدہ فضا میں شدید غم والم سے دوچار تھی۔ اس کی آنکھوں سے اشک جاری تھے، چہرہ دھواں تھا اور وہ کفِ افسوس مل رہی تھی۔ وہ وحشت کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی، اس کی پلکیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اس کی زلفیں چہرے پر اشکوں کے بادلوں کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ وہ روتے ہوئے بے وفاؤں کو یاد کر رہی تھی۔ زندہ رود اور رہ نورد اس ''پارۂ افسوں'' سے اس ویرانے میں آنے کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو وہ یہ قصہ سناتی ہے: ''میرا نام ممتاز ہے اور میں ہندوستان میں ساحل کے قریب رہتی تھی۔ میرا ہمسر خوش رو جوان تھا اور وہ خوش کلامی اور خوش خرامی میں گویا کامل تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کی باتیں اور اس کے اعمال اس کی محبت کے شاہد بھی تھے۔ وہ دن رات یہی کہتا کہ اے جانِ جاں تمھارے بغیر زندگی بے کار ہے اور تم میری ہزاروں خواہشوں کا ثمر ہو۔ ہم یک جان و دو قالب ہیں۔ یوں ایک سال رفاقت میں گزر گیا لیکن یوں سمجھیے بالکل اولین بہار کی طرح۔ ناگہاں میں بیمار ہوئی اور میرے ہمسر کی حالت مجھے دیکھ کر تباہ و برباد ہو گئی۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہو گئی۔ وہ مجھے تسلی دیتا کہ میں جلد اچھی ہو جاؤں گی۔ کاشکے میں بیمار ہو جاؤں اور تم صحت مند۔ ایک رات میری حالت اس قدر خراب ہوئی کہ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میرے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لینا۔ میں تو مر رہی ہوں تم میرے غم سے خود کو نہ مار لینا۔ وہ بولا کہ اگر تم مر گئی، تو خدانخواستہ مجھ سے بڑا کافر نہ ہو گا جو میں نے دوسری شادی کی اور تمھاری یہ باتیں مجھے بہت دکھ دے

رہی ہیں۔ بہرحال میں جہاں سے رخصت ہوگئی۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے خواہش کی کہ میں دنیا میں اپنے عاشق شوہر کو دیکھوں کہ وہ غم میں کس طرح جی رہا ہے۔ مجھے کہا بھی گیا کہ جانے کو تو تم جا رہی ہو لیکن جب واپس آؤ گی تو تمھارا انتظار صدگونہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں صرف اپنے عاشق پر نظر ڈال کر واپس آجاؤں گی۔ یہاں کے دس برسوں سے میرے لیے وہاں کا ایک لمحہ کافی ہے۔ میں دنیا میں گئی تو دیکھا کہ میرا گھر چراغوں سے روشن تھا اور شوہر نے شادی کر لی تھی۔ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ ایک عشوہ طراز عورت میرے شوہر سے کہہ رہی تھی کہ ابھی تمھاری بیوی کو گزرے ایک ہفتہ ہوا، یاد تو آتی ہوگی۔ شوہر بیزار ہو کر بولا کہ میں رات دن کی پریشانی سے تنگ آ گیا تھا، شکر ہے کہ وہ بیمار ہو کر رخصت ہوئی۔ میری جان تو تم ہو۔ اے پری، اے ماہ رُو! تم جانے والوں کی باتیں نہ کرو۔ اتنا سننا تھا کہ میں فی الفور واپس لوٹ آئی۔ یہ لمحے مجھے سیکڑوں سال کی اذیت کے مترادف لگتے ہیں اور میں اب حالت فراق میں اس ویران سرا میں ہوں۔'' یوں گویا دنیا میں جی لگانے والوں کو وہاں حالتِ فراق میں دکھایا گیا ہے۔

اگلا حصہ ''پرتوستان'' ہے جو ''برزخِ امثال'' کا آخری منطقہ ہے جہاں دنیا میں افکارِ عالیہ کے پیش کنندہ مصنّفین جمع ہیں۔ یہاں وحشت کم ہے اور منظر نامہ قدرے پُرفضا۔ یہ لوگ وہ ہیں جو حسن بے نشاں کی تجلّی سے بہرہ مند تھے لیکن ان کا حجاب انھیں سراب میں لے گیا۔ یہ باغِ جاوداں کے قریب ایسا منطقہ تھا جہاں یہ مردمانِ خوش بین و حقیقت شناس جمالِ ایزدی کے پرتو کے اُمیدوار تھے۔ شاعر نے تمثالی پیرایے میں لکھا ہے کہ وہیں اسے ایک قد آور شاہِ بلوط کا درخت دکھائی دیا جس کی شاخیں برگ و بار سے لدی پھندی تھیں اور اس کی چھاؤں تلے کئی خیمے مع ساز و سامان ڈالے گئے تھے اور اندر عالمانہ باتیں ہو رہی تھیں۔ یہاں رہ نورد ایک روشن تر مقام دیکھتا ہے جو کسی دل کشا مقام کا سراغ دے رہا تھا اور جہاں قدم قدم پر پھول کھلے تھے۔ اس کا انتظار اور تجسس بڑھ جاتا ہے کہ بقول شاعر جلوؤں کا انتظار خود جلوہ ہوتا ہے اور نغمے کی آرزو خود نغمہ۔ یہاں براجمان لوگ خوش نظر، خوش چہرہ اور پُرنور تھے۔ ان کی گفت گوئیں علمی تھیں اور ان کی محفل گلشن بے خار۔ ان کے پیش کردہ معنی پیچیدہ اور نو بہ نو تھے۔ اس مقام پر فرخ نامہ میں اوّلاً شیکسپیئر کا ذکر ہے اور اسے ''شاعر دانا''، ''خداوندِ ہنر'' اور ''نکتہ دانِ سیرتِ نوعِ بشر'' کے القاب دیتے ہوئے یہ نکتہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کے ہاں عشق، رشک، رحم، خشم، انتقام، درد و داغ، آرزوئے ناتمام، عشرتِ ناپایدار جیسے متنوع موضوعات کی شعری نقش بندی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے:

مصرعِ نظمش به صد دیوان حریف　　نقطۂ حرفش بهر عنوان لطیف

شیوۂ و آھنگ و ترتیب کلام	معنی و الفاظ را نقش دوام
در درامش دانش آموز بشر	در نمائش ھا ادیب نکتہ ور
شاعر ژرفا، حکیم روزگار	ساحر جادو بیان جادو نگار
عارف دنیا و معروف جھان	ابتکار آموز و خلاق زمان
از نمائش نامہ ھایش درحیات	سطر سطرش ترجمان حادثات
نقش بند حادثات و واقعات	رازدان زندگی بی ثبات

''زندہ رود'' اس سے پوچھتا ہے کہ اے رمز آشنا! بتا تیرے ساتھ کیا پیش آیا؟ جس پر وہ فرخ نہاد ان دونوں ہنر وابستگان کو خوش آمدید کہتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اے سفیر مشرق و مشرق نژاد! تم اُس دنیائے فانی کی کہو! جس پر رہ نورد گویا ہوتا ہے کہ جہانِ گل رُخان تو بدستور ہے۔ محبوبوں کے کرشمے بھی وہی اور عاشقوں کا دردِ حرماں بھی وہی، اربابِ کینہ کی عیاری بھی ویسی اور کم ظرفوں کی حیلہ جوئی بھی بدستور۔ ناتمام آرزوئیں اب بھی داغ داغ ہیں اور دیکھنے والوں کی چشم حیرت بھی ویسی ہی ہے اور تقدیر بھی اسی طرح خندہ زن ہے۔ تم اس راز سے پردہ اُٹھاؤ کہ انسان کو دنیا میں آرام کہاں ہے؟ جس پر شیکسپیئر کہتا ہے کہ انسان گوہر یک دانہ ہے اور اس خرد افروز کی کہانی یہ ہے کہ اس سب کے باوجود یہ مشتِ خاک بے قرار ہی اس جہانِ رنگ و بو کے لیے تازہ بہار ہے۔ انسان سود و زیاں کے نشے کا اسیر ہے اور علم و گمان کے سمندر میں غوطے کھاتا رہتا ہے۔ انسان ہی اس زندگی کی کہانی کا مرکزی کردار ہے جو کبھی ہنستا ہے، تو کبھی روتا ہے اور کبھی ہر چیز سے روگرداں ہو جاتا ہے۔

یہیں پر امریکی شاعر ایمرسن کی زبانی رمزِ زندگی کی بابت کہلوایا گیا کہ اے عزیزو! زندگی آہ و زاری یا شکوہ و شکایت کا نام نہیں۔ کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہوا کرتے ہیں۔ فقط پھولوں کو دیکھنا اور چننا ہی اصل زندگی ہے۔ جینا، مرنے سے بہتر ہے خواہ بے سر و پا ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی کے باغ میں اتنے کانٹے بھی نہیں کہ جینا دشوار ہو جائے۔ اگر تم دل رکھتے ہو تو اچھائی پر بھی یقین رکھو تا کہ تمھارے دل کا شیشہ شہد سے لبریز رہے۔

یہیں پر جرمن فلسفی کانٹ اپنا فلسفہ سنا رہا ہے کہ زندگی کی آبرو اخلاق سے ہے اور خیر و شر کے شعور کے بغیر زندگی اور ارتقائے انسانی بے معنی ہیں:

آدمی دارد شعورِ مستنیر　　باید انسان پاک دارد این ضمیر
آدمی بی روشنائی از ضمیر　　در سرابِ زندگانی تشنہ میر

جرمن فلسفی وشاعر نطشے کی زبانی یہ اظہار ملتا ہے کہ انسان پر افسوس ہے کہ وہ اپنے ہی اوہام میں الجھا رہتا ہے اور اسی کشاکش میں زندگی کی حقیقی رمز سے نا آشنا رہتا ہے۔ اس کی فطرت بے اختیار آرزوؤں کی طرح نامحکم و نااستوار ہے۔ اس کا گوہر پتھر سے بھی کم تر ہے اور اس کا جوہر زنگ آلود ہے۔ وہ ساحری تو دکھاتا ہے لیکن اس میں اعجاز نہیں۔ اس کے پر ٹوٹے ہوئے ہیں اس لیے وہ پرواز نہیں کر سکتا:

زیرِ دامِ ناتوانی خستہ ای　　آدمی صیدِ زبونِ بستہ ای
آدمی خود را نہ داد از خود نشان　　ای دریغ آن آدمِ ننگِ جہان

اسی دوران ''جہانِ نو'' ظاہر ہوتا ہے جہاں ہر لحظہ گل کھل رہے ہیں اور رہ نورد اور زندہ رود کے گرد و پیش کی دنیا خورشید سے بڑھ کر تاب ناک ہو جاتی ہے۔ نئے رنگ اپنی نمود کے لیے بے قرار معلوم ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر ''برگساں'' کا کردار نمودار ہوتا ہے، وہ فرانسیسی مفکر جس نے وقت کو سرِّ حیات اور اصل موجودات قرار دیا اور عشق کو عقل سے برتر گردانا۔ یہاں بھی اس کردار کی زبانی زندگی کا یہی نقطۂ نظر نمایاں کیا گیا ہے کہ زندگی آب و گل کے شور زار میں خوار و مضمحل اور جامد و ساکت تھی۔ زندگی نے اپنی جبلت سے عقل و خرد تک اپنا راستہ خود بنایا تا کہ پرندوں اور درندوں کی جداگانہ تفہیم کرے۔ فروغ عقل ہی سے عشق نے نمود کی۔ اس لیے زندگی جہد بقا سے پیوستہ ہے اور راستے تو بہت ہیں لیکن منزل کا تعین عشق ہی کرتا ہے۔ زندگی ادراکِ زمان کا نام ہے اور یہ ایک نئے آفاق کی تعمیر ہے۔ زندگی کا سوز و ساز مختلف ہے، یہ الگ انداز کی نماز ہے اور الگ طرح کا سجدہ:

سازِ ہستی را نوا بسیار ہست　　شاہدِ معنی بسا پُر کار ہست
گر دلی داری بدہ زانش نشان　　باز نو ساز این زمان و این مکان

اس موقعے پر جرمن شاعر گوئٹے کی زبانی حافظ شیراز کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے کہ وہ بھی اسی کُنج دل کش میں ہے:

در بلندی شعرِ تو چون آسمان　　گنبد آسا محکم و فرّخ نشان
مطلعت با مقطعت با یکدگر　　سر بسر ہم سنگ در لطف و اثر

بعدازاں گوئٹے نطشے کی حافظ شیراز کے حضور مدح کی باز گوئی کرتا ہے اور اس حصے میں بھی اوّلاً حافظ کی مدح ہے، مثلاً:

میکده ما را توئی، هم باده ای — منزلی ما را توئی هم جاده ای

مستئ صهبای تو تندست و تیز — بادۂ انگور چون خواهی تو نیز؟'

پھر شاعر شیریں بہار یعنی گوئٹے کہتا ہے کہ میں یہاں اگر اچھے حالات میں ہوں اس کی وجہ فقط اسم محمد ﷺ سے وابستگی ہے:

در جهان یك كار نیكو كرده ام — باغِ روحِ خویش خوشبو كرده ام

تخمِ خیر اندر دلِ خود كاشتم — اسم احمد را گرامی داشتم

نامِ آن سرور گرفتم ''زنده رود'' — بر روانش صد سلام و صد درود!!'

رہ نورد کہتا ہے کہ عین اس لمحے میرے رہبر ''زندہ رود'' نے کہا کہ اے بیٹے، اب رخصت ہوتے ہیں اور گلشن جنت کی جانب چلتے ہیں۔ ہمارے سامنے موتیوں کے دریا میں زرین کشتی منتظر ہے اور نظر کے لیے مزید ہزاروں تماشے۔ اب اُس جنت نشاں ساحل کی نمود ہونے کو ہے جس سے ہم مسافروں کے دلوں کی کشود ہوگی:

رنگ از گل، گل ز شاخه ها چكید — آن سوی دریا جهانِ نو دمید

فرخ نامہ کا تیسرا حصہ ''فردوسِ جمال'' (The Paradiso of Beauty) کے زیرعنوان مرقوم ہے۔ آغاز میں مناجات ہے اور شاعر عاجزانہ پیرایے میں ربط حرف و معنی کی رمزوں کے ادراک کا متمنی ہے۔ اس موقع پر انصاری صاحب نے ربط حرف و معنی پر فلسفیانہ اظہارِ خیال کیا ہے اور شاعری میں اس کی معجز نمائی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حرف ومعنی سرّی از اسرار هست — هردو را یكجائی درگفتار هست

نورِ معنی رهنمای گفتگو — معنی را آرد بیانش رو برو

حرف و معنی هردو را از تو وجود — گر بود آن را نمود این را شهود

ای خدا! ای مالك ارض وسما

اعتبار افزائی این حرف مرا

بعدازاں سیرِ افلاک کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں کشتی سیمیں دریا میں بہتی ہوئی ''فردوسِ جمال'' کے

قریں آ پہنچی تھی۔ یہاں گل وگلزار کا عالم ہے، ہر سُو خوش بو ہے، اور برگ و بار بہار دکھا رہے ہیں۔ ہر سُو سرو بلند ہیں اور قمریاں حق سرّہٗ کا نغمہ بکھیر رہی ہیں۔ نرگس کے پھول دمک رہے ہیں۔ خوش آہنگ طائر فضا میں رواں دواں ہیں اور پھولوں کی کثرت فروغ رنگ کا باعث بن رہی ہے۔ اس موقع پر زندہ رود رہ نورد سے کہتا ہے کہ شکر ایزد بجا لاؤ کہ تمھیں اس بہار جاوداں کا جلوہ دکھایا گیا۔ اس دنیا میں ہر لحظہ الفاظ وادراک مختلف معانی رکھتے ہیں اور اشیا کی ماہیت یا کیف وکم بہت مختلف صورت میں ہے۔ یہ جنت قدسیوں کی جلوہ گاہ ہے اور نیکوکاروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں ماضی اور استقبال پہلو بہ پہلو ہیں۔ یہاں اجسام، ارواح کی طرح اور روحیں جسموں کے مانند ہیں۔ تم جو کچھ یہاں دیکھ رہے ہو، کسی ابتدا کا نشان ہے۔ یہ عجیب طرح کا عالم ایجاد ہے کہ جس کا ایک ذرہ سیکڑوں سورج سے بڑھ کر ہے۔ یاد رکھو! یہاں آرزوؤں کو کاوشِ تکمیل کی اور جستجو کو عجلت کی ضرورت نہیں۔ نہ غمِ نایافت ہے اور نہ غمِ ملال۔ اس کے بجائے ہر ایک جمال کمالات سے بھرپور اور لازوال ہے۔ اے بیٹے! ہر خیال یہاں وجود رکھتا ہے اور ہر غیب شہود۔ یہ راستہ دوست کی جلوہ گاہ ہے اور یہاں کا کوئی راستہ راہِ دوست کے سوا کچھ نہیں۔ آگے بڑھو اس دنیا کا نظارہ کرو اور حال اور مستقبل پر نظر دوڑاؤ۔

دروازہ زریں کے عقب کی دنیا سیکڑوں تجلیات سے آباد نظر آتی ہے۔ یہ روشن، رنگین اور پُر بہار دنیا دیکھ کر رہ نورد حیران رہ جاتا ہے اور اسے یوں دیکھ کر زندہ رود کہتا ہے کہ حیران مت ہو یہ بہشت ہے، جو نیکوکاروں کے لیے ہے:

بهترین مردمان هر زمان — آفرین بر کارِ ایشان در جهان

این قصورو باغ و راغ وبرگ و بر — اهل خدمت را بهشتِ منتظَر

بہشت میں اولین جگہ وہ ہے جہاں بسنے والے لوگ دنیا میں دوسروں سے اچھا برتاؤ کرتے رہے اور یہاں ایک سے بڑھ کر اچھے لوگ ہیں اور حالت یہ ہے:

هر یکی در حالتِ مطلوبِ خود — هر یکی محبوب و هم محجوب خود

هریکی را صد مقال اندر خیال — هر یکی احوالِ خود را خود مثال

یہاں اندلسی فلسفی ابن رشد کو دکھایا گیا ہے جو دنیا میں دانش بے مثال رکھتا تھا۔ اس کے زمانے کے مفتی، عالم اور خواص وعوام اسے ملحد کہتے تھے لیکن بہ باطن وہ شرک اور نفاق سے بری تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کی جمعیت کا سبب بنا۔ اس نے دینِ مصطفیٰ ﷺ کو نہ چھوڑا اور اس پر قائم رہا۔ وہ پنجگانہ نماز ادا کرتا، مسجد جاتا، اور دعا کیا کرتا۔ ایک دن اپنے فرزند کے ساتھ دمشق کی مسجد میں نماز شوق ادا کرنے گیا تو اس کے عہد کے مفتیوں نے اسے درِ مسجد سے یوں نکالا

کہ پھر دنیا میں اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ابن رشد کی زبانی یہ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ میں اس روز کی ذلت کیا بیان کروں کہ مجھے اس قدر غم واندوہ تھا کہ یوں لگتا تھا دنیا میں کوئی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میں نے صبر کیا کہ چارۂ صبر سوائے صبر نہ تھا لیکن آج وہاں کا نقصان میرے لیے عزت کا باعث بنا اور میں اب یہاں شادکام ہوں۔ آگے چل کر ابن رشد کی زبانی حکمت و دانش کی قدر و منزلت پر مبنی اشعار بیان کیے گئے ہیں جنھیں سن کر زندہ رود نصیحت کرتا ہے کہ شورش عشاق کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہیں شیخ اشراق شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کا مقام دکھائی دیتا ہے جو لباسِ سہروردی میں ملبوس ہے۔ شاعر نے اس موقعے پر اس صوفی صافی کے مراتب بیان کیے ہیں اور اس کے عاشقانہ نقطۂ نظر کو اقبال کے تضمینی مصرعے کی وساطت یوں رقم کیا ہے:

آدمی اندر جهانِ خاك و آب — هرزمان باشد رهین اضطراب
"درد و داغ و سوز و ساز و آرزو" — داردش آشفته كار و كو بكو
ناتمامی ها بود سرمایه اش — خام كاری ها بود همسایه اش

یہیں "مقامِ خطیب لبیب" (غالباً شاعر کی مراد مولانا محمد علی جوہر ہیں، متوفیٰ ۱۹۳۱ء) ہے۔ شاعر نے ان کی خطابت و فصاحت اور حُسن بلاغت کو بھرپور اُسلوب میں بیان کیا ہے اور اس کردار کی زبانی استقلالِ پاکستان سے قبل فرنگیوں کے ہاتھوں غلامی کی کیفیت کا نقشہ بھی کمال بلاغت سے جمایا گیا ہے تاکہ آزادی کی حقیقت پر روشنی ڈالی جا سکے:

ای عزیزان ، حال ما ابتر شدست — شادئ مابندگان كم تر شدست
آ كه زنجیرِ غلامی بشكنیم — درس آزادی دگر ازبر كنیم

آگے "مقامِ رہبرِ معظم" (بانی پاکستان، ۱۹۴۷ء) کا مقام ہے۔ یہاں قائداعظمؒ کی چاند جیسی چمکتی پیشانی کا ذکر ہے اور قائد کی بھرپور سراپا نگاری کی گئی ہے۔ انصاری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ پیر مرد جوانوں کی طرح راست قد تھا اور اس کی خاموشی بھی سیکڑوں مدوجزر رکھتی تھی۔ شاعر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

دانشش سیراب عشق و آگهی — فكر او مبنی بر اثبات خودی
حق شناس و حق شعار و خوش نهاد — در عزیمت كامگار و با مراد
حكمت نورانیان سامان او — دانش افرنگیان حیران او

جب اس عظیم رہ نما نے رہ نورد کو زندہ رود کے ہمراہ دیکھا تو فرطِ جذبات سے پکار اُٹھا:

"زندہ رود ای زندہ رود ای زندہ رود"

مزید شعر بالترتیب دیکھیے جن میں قائد اور علامہ (زندہ رود) کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے، قائداعظمؒ کہتے ہیں:

خوش بیا ای شاعرِ رنگین نوا — خوش بیا ای دیدۂ بینای ما!

ای مسیحای دل رنجور ما — ساقیٔ میخانہ ای لاہور ما!'

زندہ رود

قائد من ، رہبر بیدار من — ای تو فوج و لشکر و سالارِ من

خوش نمودی قوم را راہ عمل — فکر تو بی اشتباہ و بی خلل!

قائداعظم زندہ رود سے مخاطب ہو کر یوں ترانہ سنج ہوتے ہیں کہ آپ ہی کے ایما پر میں نے قوم کے لیے جہانِ تازہ کی جستجو کی اور سکوتِ انجمن کو صدا آشنا کیا۔ یوں آپ کے پیغام کی وساطت سے غلاموں کو پیامِ دارائی ملا اور قوم کا رنگ بدل گیا۔

رہ نورد جنت میں، زندہ رود کی معیت میں عادل باشاہوں، دانش مندوں اور خوش نگر و خوش نام ہنروروں سے ملاقات کرتا ہے۔ یہاں ہر سُو درخت، برگ و ثمر سے آراستہ ہیں، پرندے چہچہا رہے ہیں اور جونہی ان کے قدم آگے کی جانب بڑھتے ہیں راستہ روشن تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ زندہ رود بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ دیکھو! یہ اور طرح کی جنت ہے، زمین پر چاند اُتر آئے ہیں اور ہر سنگ میں آفتاب پھوٹ رہے ہیں۔ قافلہ در قافلہ پھول رواں دواں ہیں۔ یہ زیبا و جمیل جنت عادل بادشاہوں کے لیے ہے یا اس قابل فخر گروہ کے لیے جو دنیا میں علم و دانش سے بہرہ مند ہوا اور اپنے علم و آگہی سے جمالِ زندگی کی نقش بندی کی۔ یہاں سب سے پہلے نوشیروانِ عادل کا دیدار ہوتا ہے جو ایک بلند اور مزین محل میں تخت پر براجمان ہے۔ دونوں ان کے قریب جا بیٹھتے ہیں تو زندہ رود بتاتا ہے کہ اس بادشاہ نے ایک نئے دستور کی بنیاد رکھی۔ جس پر رہ نورد اس سے کہتا ہے کہ بے شک یہ آپ کے عدل کا انعام ہے کہ آج آپ اس مقام پر ہیں۔ اس موقعے پر نوشیرواں کی زبانی بادشاہی و حکمرانی کے ذیل میں عدل کے مقام و مرتبہ پر دل پذیر نکات پیش کیے گئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عدل، خیر ہے اور شاہوں کے شایاں ہے، بادشاہی جسم اور عدل اس کی روح ہے، عدل کرنا ہی افضل بادشاہی ہے اور میری یہ حالت میرے اعمال کا اجر نہیں بلکہ یہ روشنی تو مجھے کہیں اور سے نصیب ہوئی۔ یہ

بہار جو تم دیکھ رہے ہو، یہ جناب رسالت مآب ﷺ کی رحمت کے طفیل ملی ہے اس موقع پر عشق رسول ﷺ کی کیفیت کا عالم دیکھیں جو نوشیرواں، زندہ رود اور رہ نورد کے قلبی واردات کا عکاس ہے:

آن شہِ شاهان ، امامِ مرسلان — حاصل هنگامهٔ کون ومکان
سرورٌ و سر دفتر هر دو سرا — هادیان هر زمان را پیشواٌ
نور پرور در دو عالم، مهر گر — هر چه می گوییم از آن خوب تر
عدلِ آن سردارٌ و شاهٌ دو جهان — اعتبار و آبروی عادلان
عدل آن عادلٌ کجا و من کجا — روح پاکیزه کجا و تن کجا
این فقط یك قطره رحمت است ازان — که مرا بینی به حالی این چنان
قطرهٔ رحمت به از صد آب ها — که رهاند از دو صد گرداب ها
از ظهور آن شهِ عالی جناب — عهد شاهنشاهی ام شد فیضیاب

اس موقعے پر نوشیروانِ عادل کی زبانی نصیحت آموز ابیات بھی پیش کیے گئے ہیں جو ایک عادل حکمران کے لیے منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شہیدوں کی فردوس ہی میں مظفر خان شہید کا دیدار ہوتا ہے۔ یہ مقام بڑا دل کش اور پُر بہار تھا۔ ہر سُو بہار ہے اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ ایک سیم وزر ناب اور موتیوں سے مزین جگہ پر شہید ملتان مظفر خان دونوں کو یہ کہتے ہوئے خوش آمدید کہتے ہیں کہ ملتان اولیا و اصفیا کی سرزمین ہے۔ میں اس پر قربان جاؤں! جب تم یہاں سے جاؤ تو میرا یہ پیغام اس ارض کہن کو ضرور دینا کہ کوئی اور گوہر بھی پیدا کرو، اپنے دفتر پارینہ کا مطالعہ کرو اور دیدہ وری کے جوہر دکھاؤ:

آن در گنجینه ها را باز کن
روزگار خویش را آغاز کن!

آگے کاخِ فردوسی ہے جو جنت نشان اور پُر نور و پُر بہار ہے۔ رہ نورد شاعر فرخندۂ ایران سے سوال کرتا ہے کہ شعر کا باطنی سرچشمہ کیا ہے؟ یہ فقط ذوقِ نوا اور حسن صدا تو نہیں؟ اے روشن ضمیر زندگی کیا ہے اور کیسے گزارنی چاہیے؟ جس پر فردوسی کی زبانی یہ شعر رقم کیے گئے ہیں:

شعر را با زندگی پیوستگی ست — مصدرِ اصلش ز بطن زندگی ست
شعر را باید بسی علم و هنر — تا بگردد نخل معنی بارور
علم بی پایان و دانش بی کران — شعر را باید به مثلِ پیش خوان
شاعری بی دانش و بی آگهی — دامن مضمون را دارد تهی
دانش و تخئیل و جذب و ابتکار — زین عناصر شعر گردد زرنگار
رنج بردن بهرِتحصیلِ هنر — شرط اول هست گر خواهی ثمر
با همه سرمایۀ علم وهنر — فضل ایزد بایدت یار، ای پسر!
عمر ها باید کس آرد شعر ناب — پس دگر والله اعلم بالصواب
زندگی منظومۀ طولانی است — گرچه طولانیست اما فانی است
زندگی حرفست و معنی کار ما — کار بی معنی بود آزار ما
زندگی چون شعرهست از ارتباط — فصل ووصل وربط وضبط و احتیاط
شعر ناموزون متاعِ کس مخر — زندگی بی ربط معنی بی ثمر
زندگی را از مقاصد آبروست — بی مقاصد زندگانی های وهوست

جرمن شاعر گوئٹے کا پُر بہار ٹھکانہ بھی کنارِ آب ایک کاخِ زرنگار کی صورت واقع ہے۔ رہ نورد اسے خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اور استفسار کرتے ہوئے گویا ہوتا ہے:

فکر را آیینۀ جان ساختی — برگ را رشك گلستان ساختی
شد اروپا از بهارت گل نگار — شعر تو از فکر تو سرمایه دار
ای اسیرِ شیوه شعر عجم — از کجا این شیوه را کردی بهم؟

جواباً گوئٹے اہل مشرق کی ستائش کرتا ہے اور شاعر مشرق کو اپنے شوق و رغبت کی داستان سناتا ہے۔ وہ ممکناتِ زندگانی میں آدمِ نو کے لیے عشق کو لازمی قرار دیتے ہوئے مزید کہتا ہے:

آدم نو عقل را آموزگار　　آدم نو عشق را پروردگار
رازدان پرده های ممکنات　　آدم نو آرزوی کائنات
کارِ انسان را دگر آسان کنید　　ای عزیزان عشق را ارزان کنید!

فن کاروں کی بہشت میں سرفہرست ''فردوسِ مصورِ مشرق'' ہے اس مصور کا ٹھکانہ جس نے نقش ورنگ کی دنیا پیدا کی:

آب و رنگ عالم نو آفرید　　نغمه ها از رنگ و صورت می شنید

عبدالرحمٰن چغتائی زندہ رود کو اپنے فن کے راز سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

من هنر راجان شمردم ای جوان　　شرق را رنگین همی کردم عیان
گر چه من از شرق میدادم نشان　　غرب هم دارد متاع سوز جان
باختر از سوز جان در اضطراب　　خواهد از خاورگر زنده کتاب
تا توانی صاحب ادراك شو　　شعله ای، رو، شعلهٔ بیباك شو!

'کاخِ معمارِ تاج' میں نادرِعصر اُستاد احمد لاہوری، معمارِ شاہجہاں کا قیام ہے جنھوں نے فن عمارت سازی میں کمال پیدا کیا۔ یہ خوش نہاد پیر مرد انھیں اس مقام پر پاک بین و پاک زاد اور نہایت بامراد دکھائی دیا۔ زندہ رود کے اس استفسار پر کہ آپ کا نام دنیا میں زیادہ مشہور نہیں لیکن آپ کا کام اپنی پہچان رکھتا ہے، بتائیے، آخر گم نامی میں کیا راز ہے؟ نادرالعصر لاہوری کی زبانی معجزۂ فن کا راز دل کش پیرایے میں رقم ہوا ہے جو خود علامہ اقبال کے نظریۂ فن کا عکاس بھی ہے:

شهرت و گمنامیِ ما در جهان　　موجهٔ اندیشهٔ سود و زیان
آنچه اصل ماست از تخلیق ما ست　　بودن و نا بودن از تصدیق ماست

آگے تاج محل کی فن کارانہ نمود کے بیان میں اشعار رقم کیے گئے ہیں۔

اس موقعے پر جاوید نامہ کے رنگ وآہنگ میں میرزا بیدل کی روح نمودار ہو کر غزل سرا ہوتی ہے۔ رہ نورد اس سے گذشتہ زندگی کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور مختصر شعری مکالموں میں بیدلؔ کے نظریۂ زیست کی توضیح ملتی ہے، مثلاً:

معنیِ هستی گراست اینست وبس　　زندگی را دید آئینست و بس!

عالم افسونست و ما حیرت فروش　　نا رسائی ها دم عشرت فروش

مرزا غالب دہلوی کا قصر بھی یہیں واقع ہے۔ اولاً غالب کی زبانی اس شاعر با کمال کی توصیف بیان کی گئی ہے جو لعل ناب سے بڑھ کر شعر کہنے پر قدرت رکھتا تھا۔ پھر شاعر غالب سے استفسار کرتا ہے کہ حرف اپنے معنی سے کیسے فیض یاب ہوتا ہے اور وہ باتیں جو دو بدو کہی نہیں جاسکتی ہیں، کیسے شعر کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں؟ اس پر غالب کی زبانی ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی مؤثر طور پر کی گئی ہے:

ای عزیزان قطره را جیحون کنید　　درتلاش حرف دلها خون کنید

شاعری کیف جهان معنویست　　شاعری هم جزوی از پیغمبریست

اس موقعے پر اس زنِ پیر کا احوال ہے جو دنیا میں اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود ہر رات گلی میں چراغ روشن کرتی تھی اور وہ اپنی اس معمولی سی نیکی کے طفیل بہشت میں روشنی اور نور سے ہم کنار ہوئی۔ اس حصے میں شاعر کہتا ہے کہ زندہ رود نے مجھے بتایا کہ اس جنت میں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو دنیا میں بے نام ونشان زندگی گزارتے رہے تھے لیکن آخرت میں انھیں بڑا اجر ملا۔ جس طرح زنِ پیر کا معمولی سا چراغ، چراغِ خوش بختی میں مبدل ہوگیا اسی طرح اللہ کے دربار میں قبولیت پا کر بعض اوقات چھوٹی سی نیکی بڑا اجر پاتی ہے اس لیے کہ:

ذره ای از خیر هم بی مایه نیست　　گر قبول افتد دوامِ دولتیست

ای خوش آن کاری که شد پاینده تر　　در بها افزون تر و ارزنده تر

آگے دونوں کو ''دریائے نور'' کا سامنا ہے جہاں ساقیِ دولت مدار سے خطاب ہے اور اُس سے التجا کی گئی ہے کہ تاکِ بستانِ بہار کی رونمائی کی جائے۔ شاعر نے یہاں کمال درجے کے حمدیہ ومناجاتی شعر پارے رقم کیے ہیں جن کا ملتجیانہ رنگ متاثر کن ہے:

خوش بیا ای ساقی دولت مدار　　رونما از تاک بستان بهار

تشنگان راقطرۂ صهبا ببخش　　قطره را سیرابی دریا ببخش

فرش گل راتخت و گل را تاج کن　　آبجوئی را دگر موّاج کن

جلوه هاارزان بکن با خاصگان　　نکته هاتعلیم کن باعاقلان

مستیِ خود عام کن باخواب بخت　　عشق را ارزان بکن سامان ورخت
باز رو آرم بسوی گفت خویش　　خواهم ازتو همت مردان کیش
اندران دنیای بالیده ز نور　　بود صد گونه تجلی را ظهور

زندہ رود اور رہ نورد کشتی زرین میں دریائے نور کی سیر کرتے ہیں اور رنگ، روشنی اور نغموں کے سنگ آگے کی جانب بڑھتے ہیں۔ شاعر نے یہاں ایسے فکر انگیز شعر پارے رقم کیے ہیں جن کا تخلیقی عمل سے گہرا ربط ضبط ہے۔ یہاں وہ عمل تخلیق پر استفساریہ لب و لہجے میں بھی کلام کرتا ہے، جیسے:

فکر کی می بالد ومعنٰی شود　　حرف از تمثال کی پیدا شود
نیك فهمیدم ز رمز شاعری　　خوب سنجیدم مقام آگهی
حرف را باحرف پیوستن چسان　　رنگها با رنگها بستن چسان
علم کی گردد امام شش جهات　　عشق کی گیرد زمام کائنات

بعد ازاں وہ کشتی کو ساحل پر چھوڑ کر دخترِ ماہ وش کے کارِ گل نشان تک پہنچتے ہیں۔ یہاں شاعر نے سراپا نگاری کا اعجاز دکھایا ہے اور پھر اس دخترِ ماہ وش کی زبانی آب و خاک و رنگ کی دُنیا میں ایک مثالی انسان کی آرزو اور جستجو کا یوں اظہار کیا ہے:

عشق را سرمایۂ آدم کند　　هر بنای ظلم را برهم زند
مردمان را یار یك دیگر کند　　دوستان را رشتۂ گوهر کند
دوزخ دنیا که نفرت نام اوست　　آدمی را تلخ کامی ها ازوست
آن جهنم را دگر گلشن کند　　یك بنای تازه در عالم نهد'

اس موقعے پر زندہ رود مردانِ جلیل کے جمالِ فکر سے رہ نورد کو آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو جہدِ پیہم سے کام لیتے ہیں اور ہر ظلم، زیادتی، ناانصافی اور استعماریت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ زندہ رود یہاں رہ نورد کو اپنے کلام سے رہ نمائی لینے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گویا ہے:

باختر محو فروغ تن هنوز　　فکر او غوغای 'ما و من' هنوز

خویش را از بی خودی پیدا کنید　　محشری از بانگ خود برپا کنید
ای سفیری از دیار پاک من　　ای شرارِ شعلۂ ادراک من
فکر بی باک مرا دمساز کن
سوز و ساز سینہ ام ہم راز کن!

باغ دانش میں شیخ سعدی شیرازی کا دیدار ہوتا ہے جن کی زبانی چند نصائح بیان ہوئی ہیں اور یہ گویا ان کے افکار کا خلاصہ ہیں اور نسلِ نو کے لیے ان کی حیثیت ایک منشورِ حیات کی ہے۔ یہاں اسلوبِ شاعر میں سعدی شیرازی کا رنگِ شعر در آتا ہے:

تا توانی راستی را دوست دار　　آدمی باش، آدمی را دوست دار
پردۂ بیگانگی را چاک کن　　خاطرت از گرد نفرت پاک کن
آفرین گو ہر کہ او خیری کند　　آفرین گو گرچہ آن غیری کند

سعدی کی ان پند و نصائح کے ساتھ ہی دونوں کے سامنے جہانِ نو ظاہر ہوتا ہے جہاں رنگ و مستی کا عروج ہے۔ یہاں شاعر کی پیش کردہ رنگ و نور کی تمثالیں متاثر کن ہیں اور ان خمریاتی فضاؤں میں ترانۂ بلبل شیراز حافظ شیرازی کے تحت ان کی غزل تضمین ہوئی ہے۔ بعد ازاں زندہ رود کی زبانی کلام حافظ کی مدح میں اشعار ہیں اور اس امر کا اظہار ملتا ہے کہ بظاہر حافظ نے گل و گلزار کی باتیں کی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ مخزنِ اسرار ہے۔ ان کے حرفِ ناب کو محض حدیثِ خواب نہیں سمجھنا چاہیے:

آن امام شاعران خاوران　　آن دل و چشم و روان خاوران
درسخن رمز آفرین، نکتہ شناس　　ہر نوای ساز او معنی اساس'

اس موقع پر رہ نورد کی زبانی غزلِ حافظ کی مدح میں اشعار قلم بند ہیں جو کلامِ حافظ پر بہترین تنقیدی اور شعری شذرے ہیں۔ یہیں وہ حافظ سے مخاطب ہوتا ہے کہ سکر و مستی دیوانوں کا شیوہ ہے، فرزانے تو ایسا نہیں کیا کرتے! جس پر حافظ شیراز جذب و مستی کی فضاؤں میں ڈوب جاتا ہے اور ساقیِ زرینہ جام سے کشتِ جان میں تازہ کلام کی روئیدگی کے لیے بادۂ صافی کی تمنا کرتا ہے۔ ایسا بادہ کہ جس سے جامۂ جاں تار تار ہو جائے۔ یہاں بھرپور خمریہ رنگ میں شعر پارے رقم ہوئے ہیں جن میں حافظ کی مستی کا بھرپور بیان ہے جو ان کے محبوب کوائفِ ذہنی میں سے تھی۔ شاعر عقل و عشق اور

خودی و بے خودی کے موضوعات پر تقابلی تناظر میں کہتا ہے:

نور و ظلمت روز و شب پست و بلند — زوج زوج است ای عزیز ارجمند
هوش و مستی زوج یکدیگر بود — کس ز یك کمتر نه کس بهتر بود
سکر تنها همدم بی دست و پاست — عقل تنها رهبر کم آشنا ست
ای اسیر هوش در تعدیل کوش — هوش هم بی سکر و مستی بار دوش
زیرکی افزود و بیداری نماند — هوش ها کاهید و هشیاری نماند
امتان هر زمان در اعتدال — کامگاری یافتند اندر کمال
آگهی گرچه بود اصلِ اصول — بیخودی لیکن بود باب وصول
'جهد کن در بیخودی خود را بیاب — زود تر، والله اعلم بالصواب'

بعدازاں زندہ رود کی زبانی امکانات ذات اور جہد ذات پر گفت گو ہے اور فرد کو مقامات شعور کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہاں کلامِ شاعر میں اسرارِ خودی کا رنگ نمایاں ہوتا نظر آتا ہے، جیسے:

بزم امکان رمز امکانات هست — آدمی را شرط جهد ذات هست

زندہ رود کے امکاناتِ ذات سے بھرپور ان شعر پاروں کے بیان کے ساتھ ہی ایسی وادی نمودار ہوتی ہے جو رہ نورد کے شوق کو دو چند کر دیتی ہے۔ یہ ایسی وادیِ معنی بہار ہے جہاں مرشدِ اقبال اور مرشد جملہ عاشقان، مولانا جلال الدین رومیؒ کا ظہور ہوتا ہے جو یہاں سعادتِ بشر کے لیے دعا گو ہیں۔ اس دعائیہ حصے میں رومی کے متضمن شعر پارے بھی ملتے ہیں اور یہ حصہ کلی طور پر مناجات کے رنگ میں مرقوم ہے۔ ہر ایک بیت میں انسانیت کی سربلندی کی دعائیں ہیں، اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے:

عقل را سرمایۂ آدم بساز — از شرار عشق جانش را گداز
باز او را صاحب ایام کن
کار او را فرخی فرجام کن

بلاغت سے بھرپور اس دعائیہ حصے کے بعد رہ نورد کا تاثراتی مکالمہ ہے، جہاں وہ مثنوی کے اختتامی کلمات کے طور پر کہتا ہے کہ لانہایت کا کوئی اختتام نہیں بلکہ یہ دوام کے اندر دوام ہے۔ رہبر زندہ رود کہتا ہے کہ اے رہ نورد زندہ دل! اب یہاں سے ساز و سامان اٹھاؤ، واپس جہانِ آب و خاک کی طرف چلتے ہیں اور یہیں رہ نورد حالتِ خواب سے بیدار ہو جاتا ہے اور کیا دیکھتا ہے کہ سورج سر پر چڑھ آیا ہے، یوں حدیث خواب اتمام کو پہنچتی ہے:

صبحدم بیدار گشتم من ز خواب	بر سرم برآمده بود آفتاب
روز نو روشن شده از پیش بیش	کارهای روز و شب دیدم به پیش
مرحبا ای دوستان خنده رو	باز می بینم جهان چار سو
باز یاد آرم نگاران جهان	ای خوشاروزی به بزم دوستان!

فرخ نامہ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے علامہ اقبال کے جاوید نامہ کی تکنیک میں مرقوم ہے اور بے مثال ڈرامائی فضائیں لیے ہوئے ہے۔ یہاں بھی 'جاوید' کی مناسبت سے شاعر کا اپنے فرزند 'فرخ' سے خطاب ہے اور یہ امر درحقیقت ہماری مشرقی تہذیبی روایت کے قریب تر بھی ہے۔ اس کی علامتی معنویت بھی شاعر کے پیش نظر رہی ہے اور یوں یہ اسم ہر نوجوان کے لیے ایک علامت کے طور پر آیا ہے۔ فرخ نامہ کے اسم کی ترکیب میں کامیابی و کامرانی، خوشی و سرشاری اور تعلّی و تصلیف کا وہ اظہار بھی ملتا ہے جو جاوید نامہ کے عنوان میں ہے۔ اسلوب سے قطع نظر فرخ نامہ کی جاوید نامہ سے مماثلتیں دیکھی جائیں تو دونوں میں شاعر کو آسمانی سفر کا سامنا ہے اور دونوں ہی میں مرشد کا کردار ایک پیغام آفریں شاعر ہے جو جاوید نامہ میں رومی اور فرخ نامہ میں اقبال کے شعری کردار کی صورت میں ہے۔ اس مثنوی کے زیادہ تر موضوعات وہی ہیں جو اقبال کو محبوب رہے لیکن یہاں ان موضوعات کی حیثیت فلسفیانہ سے زیادہ اخلاقی ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر ضرور رہنی چاہیے کہ علامہ اقبال بذاتِ خود فلسفیانہ و شاعرانہ پیرایے میں اخلاقیات کے مبلغ تھے اور اس اعتبار سے یہ ان کا بھی مستقل موضوع تھا۔ جاوید نامہ کی طرح فرخ نامہ میں بھی اسلامی شخصیات کو اُجاگر کیا گیا ہے، خاص طور پر وہ تاریخی کردار جنھیں اکثر دنیا میں فراموش کر دیا گیا، مثلاً ابن رشد جو ہسپانیہ کا فلسفی تھا اور جس کی یورپ نے پذیرائی نہ کی۔ اسی طرح شہاب الدین سہروردی مقتول جو اسلامی تصوف کی تاریخ میں ممتاز حوالہ ہیں اور فلسفۂ عجم میں شیخ اشراق کے نام سے مشہور ہوئے، لیکن انھیں قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح معروف شعرا و ادبا کا تذکرہ علامہ ہی کے رنگ میں ہونے کے باوجود جداگانہ اسلوبی شان رکھتا ہے جیسے شیکسپیئر،

ایمرسن، گوئٹے، برگساں، بیدل، غالب وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے دل پذیر شعر پارے رقم کیے ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ اس مثنوی میں زندہ رود کی زبانی جو شعر کہلوائے گئے ہیں وہ علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں اور رہ نورد کے مکالمے ان کے اپنے طرزِ احساس کے آئینہ دار ہیں جو بہر حال اقبال کے قریب تر ہونے کے باوجود اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اور اپنی اس انفرادیت کا انھوں نے مختلف مباحث کی پیش کش کرتے ہوئے برملا اظہار بھی کیا ہے۔ قائداعظمؒ کے ساتھ مکالمہ، نظریہ پاکستان سے انصاری صاحب کی محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی باہم محبت و موانست کا ثبوت ہے، مثلاً وہ شعری حصہ بڑا پُر تاثیر ہے جہاں قیامِ پاکستان کے حوالے سے قائداعظمؒ، علامہ سے کہتے ہیں کہ دیکھو تو تمھارے ایما پر میں نے کیا کر دیا ہے۔ اس حصے میں دونوں رہ نماؤں کے مابین پر لطف فضائیں ترتیب دی گئی ہیں جو پڑھنے والے کے لیے کشش کا سامان رکھتی ہیں۔

اخلاقی مباحث کی پیش کش کے ضمن میں اس مثنوی میں بنیادی طور پر اسلام کے نظریۂ جزا و سزا کو نمایاں کیا گیا ہے اور بالخصوص دینِ اسلام میں متعین کیے گئے عفو و درگزر کے مفہوم کی جانب واضح اشارے ملتے ہیں۔ یہاں سزا و جزا کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے فرد کی خامیوں سے درگزر کرنے کے نتیجے میں ملنے والے ثمرات نمایاں کیے گئے ہیں جو عین قرآنی تصور ہے اور اس آفاقی اخلاقی حقیقت سے بھی باخبر کیا گیا ہے جسے مکافاتِ عمل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح علامہ اقبال کا جاوید نامہ تحرک اور حرارتِ عمل کا استعارہ ہے اور ان کے ہاں حرکت آموز تصورات کی پیش کش کرتا ہے، اسی طرح اسلم انصاری کی مثنوی فرخ نامہ اخلاقی تناظر میں ان کے داخلی و قلبی احساسات کی بھرپور نمایندگی کرتی ہے۔ فرخ نامہ سیر افلاک کی اس روایت کی توسیع بھی ہے جو جزا و سزا کی اخلاقیات کے عین اسلامی تصور سے عبارت ہے۔ بلاشبہ یہ مثنوی شعریت و علمیت کا خزینہ ہے اور سیر افلاک کی پیش کش کے ضمن میں معاصر عالمی ادب میں ایک متاثر کن اضافہ ہے۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان
(پروفیسر، شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

عرض مصنف

از مطالعۂ تمدن های بشری در جهان پیداست که فرهنگِ هر ملّتِ زنده و خلّاق بیش از هر چیزی دیگر و علیٰ رغمِ علومِ عادی و متداول در آن قوم، از شعر و ادب بها می گیرد و عمق و گیرائی پیدا می کند۔ شعر و ادب از ایجادِ معانیٔ حیات و کائنات ذهنِ انسانی را روشن می ساز وهم فرهنگ را ثروت مند می کند۔ شعر و ادب جذبه های انسانی را توانا تر می سازد و آرمان هایش را برای او میرهن می کند۔

خوش بختانه بنده [اسلم انصاری] در اوائلِ جوانی بزودی باشعر و ادب علاقه مندی پیدا کردم و در آغازِ ایام دانشجوی در دانشکدۂ ایمرسن در ملتان، علاوه به زبانِ اُردو که زبانِ مِلّی کشورِ ما است، در فارسی نیز به شعر گوئی پرداختم۔ و این دل بستگی را ادامه دادم تا این که توانسته ام که پنج تا مثنوی و یك دیوانِ کامل در فارسی سروده ام۔ ''فرخنامه'' یکی از پنج تا مثنویٔ بنده ایست که اینك پیشِ خوانندگان است۔

بیمورد نیست اگر دراینجا چند تاسخن دربارۂ مثنویِ ''فرخنامه'' وکم تر ازان دربارۂ خود خدمتِ خوانندگانِ گرامی بعرض برسانم۔ چنانکه گفته ام بندۂ از بدوِ شعور به زبان و ادبِ فارسی دل بستگی فوق العاده ای داشته ام ودرین معرض

بزرگانِ خانوادۂ بنده و اساتیدِ کرام نقشی بسزا داشته اند۔ ازین بود که پیش از تکمیلِ تحصیلاتِ لسانس دردانشکدۂ ایمرسن درملتان، به شعرگوئی درفارسی پرداختم واولین غزلی فارسی را چون خدمت استاد خود شادروان پروفسور تاج محمد خان پیش کردم بسیار خوششان آمد وتحسین نموده همت افزای کردند۔ بعدازتکمیل تحصیلات لسانس، دانشجوی فوقِ لسانس به دانشکدۂ ایف سی در لاهور شدم، درهمان ایام بود که در کتابخانه سیمناری در دانشکدۂ مزبوراز مطالعۂ ادبیاتِ عالیۂ جهانی بهره اندوز شدم و بالخصوص مطالعۂ 'کامدیِ الٰهی' اثرِ معروف دانته ایطالیائی (۱۳۲۱/۱۲٦۵) بارها اتفاق افتاد۔ کتابخانۂ سیمناری متذکره دارای نسخه هائی مختلف این اثربود که از تابلوهای نقاشان بزرگ مثلِ گستاو دورے فرانسوی مزیّن بود۔ من ازین نسخه های مصوَر تاثیر فوق العاده ای گرفتم۔ و بعضے از اوقات فکر می کردم که چه خوش بود اگر منظومه ای دیگری ازین نوع از مشرق زمین بظهور می آمد۔ این آرزو متضمنِ این خواهش هم بود، ولو آنکه صریح و شعوری نبود که اگر چنین اثری دیگر بتوسط بنده رقم پذیرد، ازین چه بهتر۔! اما بعداً درتحصیلِ علومِ درجۂ فوق لسانس در اردو و فارسی در جامعۂ پنجاب لاهور مشغول شدم، و به زمینه هائی ادب و انتقاد و تاریخ و فلسفه و اخلاق و تصوف و بیشتر ازین شعر گوئی در اردو وهم نقد نگاری در این زبان ملّی ما بیشتر اوقاتِ عزیز را صرف نمودم۔ بایدتذکر بدهم که "کامدیِ الٰهی" از دانته ایطالیائی از صدها سال بطورِ بزرگ ترین اثرِادبیِ جهان بشمار رفته است۔ این منظومه مشتمل بر احوالِ سیرِمصنف در عالم علوی (دوزخ، برزخ و بهشت) می باشد که

شرحِ آن تاثیر عظیم براذهان ادیبان و خوانندگان جهان داشته است۔ اما در سال هائی بعد معلومم شد که این منظومه که درباختر از حیث اثر مبتکرانهٔ دانته معرفی داشته است، دراصل تحتِ تاثیر احوالِ معروفِ معراجِ پیامبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم۔ و نیز تحتِ تاثیر آثارِ ادبیِ اسلامی مثل "فتوحاتِ مکیة" از ابن العربی و "رسالة الغفران" از ابولعلاء المعرّی بوجود آمده بود۔ سنتِ شعرای بزرگِ زبانِ فارسی مثلِ نظامی گنجوی، نورالدین جامی، و امیر خسرو دهلوی هم بوده است که ایشانِ بعد از سرودن شعر در حمد و مناجات، چون به نعتِ پیمبرِ اکرم صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم پرداختند، دربارهٔ معراجِ آنحضرت صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم هم اشعار جاذب و فکرانگیزوپرسوز به سلك نگارش در آوردند۔ امّا بعضء از بزرگانِ شعر از معراج های فردیٔ خود بم پرداختند و آثارِ جاذب و چشم گیر گذاشتند، مثلِ سنائی غزنوی که در مثنوی "سیر العباد الی المعاد" در بیانِ سفرِ خود در جهانِ دیگر سروده و داستان های عجیب نشان داده۔ همین طور شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی در کتابِ معروف خود "فتوحاتِ مکیه" احوال سفرِ آسمانی خود بیان کرده است۔ درسدهٔ اخیر علامهٔ بزرگ علامه محمد اقبال (لاهوری) این سنت را به سرودنِ مثنویٔ بزرگ "جاویدنامه" تازه داشت که مشتمل بر احوالِ سیاحتِ عالم علوی اوست که دراصل سیاحتِ هفت افلاك منسوب به هفت سیارگان است۔ علامهٔ مزبور در این سیاحتِ علوی جلال الدین رومیؒ را که مرشدکاملِ خود قرارداده بود، رهبرورهنما داشت۔ طبعی بود که چون به حسبِ اتفاق و به توفیق ایزدی بنده به چنین کارِ سترگ پردازم، خود علامه اقبال را که در

"جاوید نامه" خود را "زنده رود" نامیده است، در سیرِ روحانی خود رهبرو ره نما بگیرم۔

در ایامیکه من مدیراقامتِ گزین ملتان آرٹس کونسل (1975 تا 1979) بودم، دفعتًه داعیۂ شعرگوئی در فارسی مرا وادار کرد که جزوی از "فرخنامه" بنگارم۔ چون شوق خامه فرسائی رهنما بود وتوفیق رفیق شد، این کاررا ادامه دادم و درمدتِ دست کم نُه ماه اوّلین دست نویس "فرخنامه" را درسال 1978 به پایانِ رساندم۔ امّا هرگاه که برای تجدیدِ نظر این دست نویس را ورق گردانی کردم، حاضرنشدم که بلافصل زمانی این را به چاپ برسانم! همیشه فکر میکردم که در بسیاری از مواردایں مثنوی نیاز به تجدیدِ نظر وحتیٰ به کاستن و پیراستن دارد۔ واین حکایتِ دیگر است۔

وقتیکه جوان بودم و از آرزو های گوناگوں سرشار، شنیدم و در زندگی نامه های شاعرِ المانوی گؤته هم خواندم که او به پایان رساندنِ نمایشنامۂ خود که شاهکار ادبی است و به عنوان "فاؤست" شهرۂ آفاق است۔ شصت سال صرف کرد۔ هرگاه که دربارۂ این نکته فکرکردم، در حیرت بماندم که چه طور است که کسی در مدتِ طولانئ شصت سال کتابی را به پایان برساند ؟ قدرتِ خداوندی پاسخِ این سوال را بصورتِ "فرخنامه" بنده را ارزانی فرمود۔ بدین صورت که هر چند این مثنوی که مشتملبر بیش از چهارده صدبیت بود، بعضی از اوقات سالها زیر انبار کتابها و اوراقِ نوشته و نیم نوشتۂ بنده نادیده بماند۔ هرگاه که اتفاقاً گیرشد، کارِ تجدیدِ نظر را بوقتِ دیگر گذاشتم۔ این عملِ یافتن و نایافتن دست نویس این

مثنوی ادامه یافت، تااینکه سالها همین طور بگذشت۔ امّا سالِ گذشته (2019ء) تصمیم گرفتم که هرچه باداباد،من باید که کشتی درآب بیاندازم تا کارِ تجدید و کاستن و بیراستنِ متن به انجام برسد و این منظومه آماده برای چاپ شود۔ چنانچه به توفیق ایزد متعال چنین بعمل آمد۔فللّٰه الحمد۔ اما این کار هرگز ممکن نبود اگر فاضلِ عزیز سید صبیح الحسن عابدی مثنوی را کاملاً حروف چینی نکرد بنده به صمیم قلب مدیون آن عزیز هستم ۔ ۔

"فرخ نامه" هر چند که در چهار چوب فلسفۂ اخلاقیِ جزاوسزا ی اسلامی نوشته شده است، این را کتابِ عقائد نبایدشمرد۔ چنانکه در آغازِ مثنوی هم گفته ام که این را باید افسانه (فکشن) دانست۔ برای همین است که بجای دوزخ و برزخ و بهشتِ اصطلاحی، سه جزوِ کتاب را علی الترتیب تحت عنوان "وادی ظلال" (Valley of Shadows)، "برزخِ امثال" (Purgatory of Forms) و "فردوسِ جمال" (Paradise of Beauty) نگاشته ام تا هیچگونه اشتباه باادبِ دینی نداشته باشد۔ بعضی از اجزای اولین متن مثنوی رابوجوه کاسته ام و بعضی اجزا افزوده هم شد، تا این منظومه صورتِ موجوده گرفته است۔ اما نتوانسته ام بگویم که ساختارِ این منظومۂ نسبۃً طولانی چنانکه می بایست هست یانیست!

این هم نمی توانم بگویم که این کارِ محقر دارای چه ارزش باشد۔ اینجا باید توضیح بدهم که هر چند که بنده تحتِ تاثیر علامه اقبال بوده ام، أمَّا آوازِ طبعِ موزونِ خود که خدا داداست، از همه بیشتر شنیده وبر بربطِ شعرِ خود نواخته ام، پس بگزارید بگویم که "فرخنامه" کاملاً تقلیدی نیست که در پیروئ دانته یا علامه

اقبال لاهوری نوشته شد۔ درزبان و تراکیب وطرزِ ادا باهمهٔ خوبی و خامی ها هیچ گاه تقلید کس نکرده ام۔ این اسلوب که درفرخنامه و مثنوی های دیگر بنده که پیش ازین چاپ شد، پیداکردم ، طبعزاد است۔ چنانکه می توان از مطالعهٔ این مثنوی هادرك کرد! اینجا هم اجمالاً بعرض برسانم که علاوه بدیوان غزلها و منظومه ها،من پنج تا مثنوی درفارسی بسلكِ نظم بکشیده ام که دوتاازین (چراغ لاله و نگارخاطر) بچاپ رسیده است۔

درسالهای گذشته این خانهٔ فرهنگِ جمهوریٔ اسلامی، ملتان بوده است که علاقه مندیٔ بنده با زبانِ فارسی را استوار داشت۔ دراین معرض برای دست اندر کاران و مسئولانِ خانهٔ فرهنگِ مزبور، بالخصوص خانم سعیده بخاری و خانم زاهده بخاری را مدیون هستم وتشکراتِ بی پایان برای ایشان ابراز می نمایم۔ نیزآقایٔ تقی صادقی (رائیزن فرهنگی اسبق رائیزنی جمهوری اسلامی ایران درپاکستان) را هم بصمیم قلب سپاس می گذارم که آثارِ شعریٔ بنده را ارج نهادند و موردِ تحسین قراردادند، ودر جمع آوریٔ اجزای شاعریٔ بنده خانم سعیده بخاری را وادار کردند و این خانم را (با توجه به مثنویٔ معنوی) 'ضیاء الدین' لقب دادند!۔

''فرخنامه'' ۔ عنوانِ خود را از نام پسرِ ارجمند بنده آصف علی فرخ (سلمه اللّٰه تعالیٰ) گرفته است، اما من این را به اولادِ خود ۔ قاسم علی خرم، آصف علی فرخ و دکتر مسعود علی انصاری منسوب می کنم۔ و برای حفظ و سلامتی و اقبال ایشان و همهٔ دوستان و خیرخواهانِ خود بدرگاه ایزد متعال دست بدعا هستم و دربارگاه ملهمِ حقائق و معانی ملتجیٔ هستم که این کارِ محقر در معرض قبولیت وپسندیدگی

بیافتد۔ وافادۂ عمومِ فکری و اخلاقی که مقصود اصلی از سرودن این مثنوی بوده است صورت بپذیرد۔

و اگر این منظومۂ ناچیز در استوار تر و پائدار تر ساختین روابط فرهنگئ پاکستان و ایران نقشی بسزا ایفا کند، احساسِ خوش بختئ بنده ده چند میباشد، از انکه درین صورت می توانم بگریم ع شادم از زندگئ خویش که کاری کردم ۔

در آخر لازم است که شکرِ رئیسۂ اقبال اکادمی پاکستان سرکار خانم دکتر بصیره عنبرین ادا کنم که بچاپ رساندنِ این منظومه را بعهدهٗ ادارۂ مؤقر اقبال اکادمی پاکستان داشتند و آرائش و ویرائش این کتاب را لازم دانستند۔ برای خطای و نقاشی نیز برای عزیز م مختار علی که خطاط و نقاشِ نامی اند۔ شکر ادا کنم که سرورق و نقاشیهای این کتاب مرهون آن عزیز است ۔

بنده این اثر حقیر خویش را بدونِ هیچگونه ادعائی خوش کلامی وهم بغیر انکسار رسمی، خدمتِ همه دوست داران زبان فارسی پیش می کنم۔ ودرآخر این هم بخواهم بگویم که اساسِ فکرئ این منظومه در شعر ساده و بدیع می توان، ابراز کرد:

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

(پروفسور دکتر) محمد اسلم انصاری

(ملتان۔ پاکستان)

29/فروری۔ 2020ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

سالها رفت و منِ افسرده دل
از فراقِ دوستان بس مضمحل

چارسو دیدم جهانِ رنگ و بو
بی نشاط خاطر و بی آرزو

کوبکو با این و آن پرداختم
سوبسو گنجینهٔ دل باختم

گه تفکر ، گه تغزل ، گه سرود
کارِ من از هیچ یك آسان نبود

عشقِ مه رویان گهی ورزیدمی
گاه دامن زین همه برچیدمی

گاه این سو گاه آن سو تاختم
گه بمشرق گه بمغرب ساختم

شعر و نغمه را گهی کردم رفیق
گه گرفتم دامنِ فکرِ عمیق

گه طبیعت را گرفتم یارِ جان
گاه دیدم این همه آزارِ جان

گه زمادیّون تسلی یافتم
گاه با روحانیان پرداختم

صد تفکر رانشان بی حاصلی
صد تأمل بستهٔ نا آگهی

داغِ محرومی و سوزِ آرزو
نارسائی ها پسِ هر جستجو

دوست دیدم مردمِ بیگانه خو
با حریفان با تلطّف گفتگو

صحبتِ اربابِ معنی یافتم
هر گهر کان یافتم، انداختم

گریه های نیم شب رودادگاه
گه سروکارم سحر با آه آه

سودها از دست دادم بیگمان
هم خریدم صد زیان از نا کسان

روزگارم این چنین من آنچنان ناگهان یك پیش آمد شد عیان

اعتذار

پیش ازینکه این حکایت سرکنم باید این ابهام را یکسو نهم
ای مخاطب! رمزِ معنی خوش بدان این حکایت از رهِ تمثیل خوان
استعارت جوهرِ افسانه ایست بادهٔ معنی ازین پیمانه ایست
این که من درفارسی کردم رقم زنده کردن خواستم شعرِ عجم
سنتِ اقبال و بیدل بوده است میرزا غالب بریں افزوده است
مثنویٔ مولویٔ معنوی آن جهانِ حکمت و فرزانگی
دوستدارِ شعر و نظمِ فارسی بوده ایم از خواندنِ آن مثنوی
باز حرفی سرکنم از کارِ خویش باز دارم گل کنم گفتارِ خویش
سالها پیش این سخن آغاز شد فارسی گوئی بمن دمساز شد
بارها تعطیل شد این گفتگو بارها گردانَدم زین کار رو
بارها چون بیدلی افسون بخواند سالها این نظم نادیده بماند
بارها برگشتم از راهِ دراز تاکنم این دفتری راباز ، باز
بارها درمانده ام از کارِ خویش خواستم پس می روم نارفته پیش
روزی شعر جامی ام گشته سروش گفت جامی از خمم جامی بنوش
"یك نفس زین گفتگو منشین خموش چون گرفتی پیش، در اتمام کوش"
هم چنین گفت است مولانای روم آن محیطِ حکمت و بحرِ علوم:

”دوست دارد دوست این آشفتگی کوششِ بیهوده به از خفتگی“
کی توانستم بگویم این سخن دستگیرم گشت لطف ذوالمنن
باز عودِ خویش را بنواختم پس زیادِ دوست یاری خواستم
نغمه را بیدار کردم از سکوت المدد ای رب حیّ لایموت
باز خوانم نام محمودِ رسولٌ نام اوبردن بود شرطِ قبول
هر که خاکِ پای آن سردار نیست نزدِ ماجز سنگ و خاک و خار نیست
شمعِ هستی را فروغ از نورِ او آنکه رخشانَد جهانِ چار سو
”جمله عالم نسخه و دیباچه اوست جمله عالم بندگان و خواجه اوست“
بعد ازین درکار کوشیدم بسی بادۀ شیراز نوشیدم بسی
مهربان گردید در آخر سروش مژده ای از فتحِ باب آمد بگوش
می کنم اکنون ز جریانی بیان که ازش در ابتدا دادم نشان
[گر کسی پرسد زمن نام و نشان اسلمِ انصاری ام از مولتان
مولتان آن شارسانِ اهلِ دل ذکرِ حق را زنده دارِ متصل
مولتان آن قریۀ روشندلان سجده گاهِ عارفان و مقبلان
مولتان آن شارسان محترم ای خدا آباد دارش از کرم
شعر می گفتم من از بدوِ شعور هم غزل هم نظم از ذوقِ حضور
چونکه در طفلی ز سر رفتم پدر درد طفلان داشتم من بیشتر
از نیاگان و بزرگان بهره مند راهِ علم و آگهی کردم پسند]

حدیثِ خواب

عصرِ پائیزی و ماجرای شگفت آور

من بُدم روزی بحسبِ التزام — بر کنارِ آبجو محوِ خرام
عینِ بیداری و عین خواب بود — کس سرِ جوئی مرا از من ربود
شامگاهان بود و ابر آلود بود — نی مه و نی اخترك چهره نمود
باد کم کم تند گشت و تیز تر — هم هجومِ یاس غم انگیز تر
لحظه لحظه تیرگی افزون شده — آبجو پُرآب چون جیحون شده
پُر نهیب و پُرصدا و پُر گزند — نخل ها چون کوهساران سر بلند
شاخه ها و برگ ها راهم ببست — سوبسو دیدم که هر سو جنگل است
رفته رفته دورتر رفتم زجو — سوی جنگل ناگهان آورده رو
شاخها با شاخها پیچیده سخت — جنگلی انبوه و پُرخار و درخت
لرزه بر اندام بنده مو بمو — صد صدای پُر نهیب از چار سو
نی کسی از حال من آگاه بود — نی مرا این سو نه آن سو راه بود
صد تمنا در دل من خون شده — یاسها بالید و بیم افزون شده
دشمنِ جان بود هر یك شاخ و برگ — کس نه بوده یار من جز ترس مرگ
ناخود آگاهی مرا اینجا رساند — وای آن رهرو که همچو من بماند

مناجات رهنورد

گفتم: "ای نظم آفرینِ کائنات — صد تجلی از تو اندر شش جهات

جز پناهت نیست در عالم پناه — جز به تو باهیچ ذره نیست راه
ای ورای حرف و تشبیه و خیال — ای بجان بخشندهٔ ذوقِ جمال
ای خریدارِ متاعِ کس مخر — ای ز ره گمگشتگان را راهبر
من که درغم مبتلا افتاده ام — دستگیرم باش و بنما جاده ام"

پیکر زنده رود ظاهر می شود

ناگهان گوئی که یك پیکر دمید — زان سوی جنگل بمن آمد پدید
پیکری رخشنده تر چون ماهتاب — پیکری درتابش خود آفتاب
آفتابِ شعر و فرهنگ و هنر — یعنی آن اقبال آن صاحب نظر
شاعرِ برنا بنام 'زنده رود' — آنکه صد نغمه بیك بربط سرود

تجلیلِ زنده رود از رهنورد

گفتم: "ای صورت گرِ عهدِ نوی — ای گل فصل بهارِ معنوی
ای فروغِ دیدهٔ آزادگان — بافر از تو ملتِ اسلامیان
ای شعورِ ما ز تو سرمایه دار — کس نیامد همچو تو در روزگار
گلخنِ مارا گلستان ساختی — خاكِ مارا مطلعِ جان ساختی
خفتگان را بختِ بیدار آمدی — مثلِ فصلِ گل بگلزار آمدی
فکرِ خود را خوان یغما ساختی — ای خوش آن روزی که با ما ساختی
رهبر فرزانهٔ ما آمدی — مژدهٔ نوروزِ فردا آمدی
رهنمای کاروانِ من توئی — هم درین ره پاسبانِ من توئی

خطابِ زنده رود با رهنورد

زنده رود رهبریٔ رهنورد را به عهدهٔ خود می گیرد

گفت بامن آن عزیزِ روزگار ”این پریشان خاطری با من سپار
راه گم کردن زرمزِ زندگیست یعنی این آغاز سیرِ معنویست
اندرین ره هر چه بینی نیك بین رسم و راهِ این طریق است این چنین
آنچه می بینی زذرّه بیش نیست از محیطِ آب قطره بیش نیست
عالم ما گر بهارستان بود این همه یك غنچهٔ خندان بود
این سفر صد حکمتت ارزان کند بر توکارِ زندگی آسان کند
این زمان و این مکانی دیگر است ساعتی اینجا جهانِ دیگراست
تو نمی دانی چه رنگست این جهان روزی این عالم قرونِ آنجهان
هرچه پیش آید اگرچه صورتست معنیٔ معنیست کاین صورت ببست“
این بگفت و دست بر دوشم نهاد باز خندید آن حکیم پاك زاد
گفت همت ساز کن ،ترسان مشو از عجائب این قدر حیران مشو
”حق زمین و آسمان را ساخته درمیان بس نار و نور افراخته“
دشت و کوهسار و بهار و باغ و راغ وز مه و انجم فروزان صد چراغ
کره های نار وکره های نور حلقه حلقه صد جهانِ نزد و دور
هم ببین و هم بفهم و هم برو در طریقِ رهروی غافل مشو“
این چنین گفت و سفر آغاز کرد رهبرِ من رهبری راساز کرد

اندران پیچاك های شاخ شاخ | راه پیدا شد به پیش ما فراخ
گرچه سنگین چون رهِ کوهسار بود | ره کمی روشن تر و بی خار بود
تپه های کوه آمد در نظر | در پسِ آن یك کهن دژ دور تر
آن کهن دژ را دری شد هم عیان | آن دری چون درهٔ کوهِ گران
زود تر دیدم که ما آنجاستیم | روبروی روز بی فرداستیم
آن کهن دژ در بلندی آسمان | دیدنِ آن می ربود از دل توان
کهنه دیوارش بلند و بس طویل | گه مهیب و گاه سنگین و جلیل
در دلم اندیشه ها سر بر زده | ترسِ مرگ از چارسو شهپر زده
رهبرم گفت 'ای سفرناکرده دوست | هرکجا بینی سروسامان اوست
دست هرنامحرم و نادان مگیر | منزلِ دشوار را آسان بگیر'

بخشِ اوّل

وادیٔ ظلال

(The Valley of Shadows)

وادیٔ ظلال

(The Valley of Shadows)

بر کناره ای وادیٔ ظلمات که پُراز شعله های آتشِ سیاه ونیلگون است وهیچ کس را زهرهٔ رفتن دران یا عبورازان نباشد،راهی بس باریك و نیمروشن است که مسافران را سوی وادی ظلال رهبری می کند ،رهنورد به رهبریٔ زنده رود ازین راهِ باریك و نیم روشن سوی آن وادی رهسپاراست۔

ظلمتی دیدیم ما پیدا ز دور — کس نه هرگز کرده بود آن راعبور
ظلمتی پُر آتش و دودِ سیاه — از درونش سر همی زد آه آه
گو جهنم نی ولی جزوی ازان — اوفتاده گوئی چون کوهِ گران
برکنارش رهگزر باریك تر — گه گهی روشن گهی تاریك تر
آن رهِ باریك پیمودیم ما — تپه ها در آخرش دیدیم ما
رهگزر طے کرده چون بالا شدیم — راست میگویم کمی خسته شدیم
درنظر می آمد آن بالا حصار — با درِ سنگین و کهنه روزگار
نی کس آنجا پاسبان نی دوربین — برسرِ لوح این دوحرفِ خشمگین
"بشنود هرکس که تا اینجا رسید — پاك شوید دل زهر نقش امید"
گفت زنده رود بامن : 'ای پسر ! — این مقامِ خوف باشد سربسر

لیك مـا از رحـمـتِ پـروردگـار / زودتـر بـرویـم تـا جـای قـرار
مـا ازیـن جای بد و نا ارجـمـند / مـی رویـم آسان و نا خورده گزند
لیـکـن اکنون هر چه می آید پدید / بـاید از دو دیـدگـان آن را بدید!'
انـدرون رفتـه بـدیـدم عـرصـه ای / از نشـانِ زنـدگـی یـکسـر تهـی
نـی درآن برگ و ثمر نی باغ و راغ / نـی بـه جائیگاه از دوزخ سراغ!
گفتم: 'این را کی سقر گفتن رواست / گر جهنم هست این، آتش کجاست'
رهبرم گفت: 'ای جوانِ هوشمند / هر جهنم نیست ز آتش بهره مند!
هر گـنـاهـی را حسابی دیگر است / هر جـنـایت را عذابی دیگر است
چـون الم تقدیـرِ بد فرجام شد / سـوختـن نـوعـی ز صد آلام شد
بهرِ هر زشتی اذیت دیـگـر است / هر جهنم را عـقـوبت دیگر است
از گـروه مـردمـان اینك ببین / بهـر مـا هسـت ایـن گـروهِ اولیـن'

گروهِ مرد مانیکه در جهان عاجلانه زیستند

عـرصـهٔ آمـد پدید آنجا عجیب / بـا هـجـوم مردمان کم نـصیب
مـردمـانِ مـضـطرب بهرِ عـمـل / کـار های شان بعجلت بی محل
گـه نشستـنـد و گهی برخـاستـنـد / گـاه افـزودند و گـاهـی کـاستند
کـار شـان لیـکـن بـمـانده بی ثمر / نـی ازان صـورت دمیده نـی اثر
حـرف هـاگـفتند بـی ذوقِ سخن / حـرفها چـون 'رومرو' یا 'کن مکن'
رهبرِ مـن گـفت با من این'' کسان / عـاجـلانـه زیستـنـد انـدر جهان

از فسون عجلت و نا محکمی — کارِ شان راحاصل این بی حاصلی
صبر و تمکین ازحق است ای ذوفنون — کار نامحکم بود آخر زبون'

گروهی از مردمان که کم کوش بودند

ردشده زین جا بدیدم مردمان — دوخته اندر خلا شان دیدگان
هریکی چون پیکرِ تصویر بود — هریکی در قید بی زنجیر بود
هریکی نقدِ سکوت اندوخته — چون بتِ سنگین دو دیده دوخته
گو بیك دیگر قرین و متصل — ساکت و صامت چو پیکر های گِل
پیکران چو مردمانِ واقعی — لیکن از جنبش تن ایشان تهی
خوب چون دیدم من ایشان رابنو — یافتم شان را بحدی سست رو
چشم بستن یا کشادن درمثال — بهرِ ایشان بود کار ماه و سال
جنبش ایشان به ماه و سال بود — خنده شان در ماه ها رو می نمود
هادیٔ من گفت "دیدی این کسان — سست کوش اند این همه بس ناقصان
سست کوش و سهل انگار اند این — بی تحرك، بی تمنا، بی یقین
این همه اربابِ تعطیل آمدند — مستعد از بهرِ کاری نامدند
هر سحر گفتند اینك می رویم — شامگه گفتند فردا می کنیم
'روز و فردا' روزگارِ شان ببرد — عمرِ شان از دستِ شان آسان ببرد'
این بگفت و رد شدیم از آن مکان — تا که ما بینیم حالِ دیگران
یك بیك تاریك گشته آن دیار — رفت از دستم عنانِ اختیار

ره نورد در تاریکی می ترسد

این جهانِ غم کجا و من کجا
عالم اضداد و بیش و کم کجا

صحبتِ یاران خوش گفتار کو
آن گل و گلزار و جوی بار کو

ای دریغ آن عهد مستی و شباب
حیف، در کنج گل آن شغل کتاب

سایه سایه این چه ظلمت خانه ایست
خواب و افسون است یا افسانه ایست

حلقه حلقه این چه دود آویخت است
این قیامت را کدام انگیخت است

ای تخیل، ای تصور، ای خیال
گر بداری مقدرت ، دیگر ببال

من کجا و رهبرِ فرزانه کو
آن خیالِ ساقی و پیمانه کو

این غبار از چیست این شور از کجاست
از کجا و چون هوای مرگ زاست

سایه های تیره و طغیانِ دود
بندِ این سیلِ ظلم را که کشود

ای دریغ این هجرِ مه رویان دریغ
ای فراقِ صحبتِ یاران دریغ

آنچه می گویند دوزخ دوری است
آتش سوزان مگر مهجوری است

می توان گفتن جدائی آتش است
وصل گلزاراست وفصل آتش وش است

تاتوانی رُو ز روی خوش متاب
تا نیافتی اندرین نارِ حجاب

رونما ای ساقئ شعله بدن
تانه سوزاند فراقِ انجمن

ای چراغِ جان بیای ونورپاش
از شرارِ آرزو صد گل تراش

دشتِ زرد

یك بیك محسوس کردم بادسرد
پیش آمد قطعه ای از دشتِ زرد

خاکِ آن از بس که وحشت خیز بود / تابِ رفتار از منِ بیدل ربود
نی نهالی، نی گلی، نی شاخ و برگ / هرچه بوده زرد بود از ترسِ مرگ
نی بجای آبگه نی آبجو / ریگِ خشن و زرد بوده تو به تو
فکر و آگاهی دران معنی نداشت / کس دران تخمِ صدای دل نه کاشت
بود آن صحرای بی کوه و کمر / بی تجلی های خورشید وقمر
گاه تیره گاه روشن بود دشت / گاه سنگ و گاه آهن بود دشت
بی شرارِ زندگی بود آن زمین / نی مکین آنجا نه کس اندر کمین
بی شعورِ خویشتن بودآن جهان / بی سرودِ 'ماومن' بود آن جهان
چارسو دیدیم ریگِ زرد بود / باد آنجا مثل آه سرد بود
رهبرِ من گفت با من: 'ای پسر! / در تحیر گم نه باشی سربسر
هرچه آید پیش ما زان برگزر / یك نظر کافیست، اینجایك نظر'!
چون بیاد آوردم آن پندِ حکیم / از پئی رفتن نمی گشتم سقیم
کار من آسودن و خفتن نبود / جز براهِ خویشتن رفتن نبور
شوق را سامان منزل ساختم / تا براهِ بی نشان پرداختم
ناگهان زان عالم بی کیف وکم / پیکری پیداهمی شد دم بدم
مردکی ژولیده مو و زرد رو / ریگِ صحرا بر لباسش تو به تو
گفت: 'این صحرا که می بینی منم / ذره های دشت باشد از تنم
گرچه نامم درجهان معلوم بود / دردلم خوفِ خدامعدوم بود
گو بظاهر عالم دین بوده ام / پُر زمکر و فتنه و کین بوده ام

کیسه های سیم و زر اندوختم | روز و شب در حُب دنیا سوختم
شرع را بازیچه خود ساختم | نقد ایمان را چه ارزان باختم
دشمن حق آشنایان بوده ام | مرشدِ هرزه سرایان بوده ام
این جهان زرد تمثیل زراست | کزخس و خاشاك عالم کمتر است
زر پرستیدم اسیر زر شدم | بد بکردم، عاقبت بدترشدم
بود درویشی فقیری خوش نهاد | در زمان ما به اوصافِ زیاد
از گروه عارفان سرّ دین | نکته دان حکمت شرعِ مبین
مردی از مردانِ حق آثار بود | بی گمان او صاحبِ کردار بود
جوهر فقرش مگر کم دیدمی | من پئی آزار او کوشیدمی
بر درِ شاهان نه سائید او جبین | آفرین بر جان پاکش آفرین
آخرش کشتند بر فتوای من | وای من ای وای من ای وای من(۱)"
این چنین گفت آن فقیهِ بی وقار | بانگ بر زد وانگهان نالید زار
شعلهٔ بی نورِ او چو دود شد | در فضای زردگون نابود شد

خارستان

یك بیك رویم بمنزل گاه بود | منزلی کز دیندنش اکراه بود
منزلی چون باغ لیکن باغ نی | اندران آثارِ باغ و راغ نی

(۱) اینجا اشاره به یکی از فقهای مزورِ عصرپیش از تیموریان هند شده که به جاه پسندی و زراندوزی شهرت تامه داشت،از درباریان سلیم شاه سوری بود که بسیار مردان بی گناه را به فتوای این فقیه به قتل رسانید

خـــارزاری بـــود پُـراز خـــارهـــا
جـای گـل بـر شاخـه ها آزار ها

خارِ نخـل و خارِ شاخ و خارِ برگ
هر کـجـا دیـدم سروسامان مرگ

شـاخـــه هـا از تیغ ها بُرّنده تر
خـــار هـــا از دام و دد درّنـده تـر

آن زمیـن گوئی که روی گل ندید
کـاندران هر لحظه خارستان دمید

هر بنی، هر شاخساری خونچکان
خـار هـا از چـار سـو دیـدم عیان

جـای سبـزه خـار ها روئیده بود
صد غم و اندوه ز ان جوشیده بود

یك کـمـی نـگـریستم، حیران شدم
بـاز بـر آن راهِ خـود پـویان شـدم

نـاگهـان لـرزیـد نـخـلـی سربلند
بانگ برزد: ”ای جـوانِ هوشمند

از بـرِ مـا ایـنـچنیـن آسـان مرو
هـمـچـو گل از محفل خاران مرو“

مـن دران ویـرانـه ای خونین بهار
زار گشتـــم از هـــوای نـــاگـــوار

آن صـدا پیـچیده و لرزیده بـود
در سخن گشتن نفس دزدیده بود

گفتمش: ”ای نخلِ بی برگ و ثمر
چـون زبـون گشتی، چراباشی بتر؟

رنـجهـا در ریشـــه ها پـرورده ای
بـاز گو، آخر چه کاری کرده ای؟“

گـفـت: ”گـو بودیم ما همچو نجوم
بیـن کـه گشتـه خاروزرداب وزقوم

در ستـم کیشـــی بیـــافـزودیـم مـا
بـنـد هـا از مـردمـان نکشودیم ما

نـکتـه چیـن و عیـب جو و هرزه گو
اینـچنیـن بـودیم ما ای نیك خو!

مـردمـان آئیـنـه و مـا سنگ پاش
مـردمـان گـلهـا و ما خارا تراش

چـون زبـان مـا بسـا طـرّار بـود
زخـمِ طـعـن مـا بـدل بسیـار بـود

مـردمـان از طـعـن ما آشفتـه تر
مـا ز درد شـان و لیـکـن بـی خبر

کارِ ما بیهوده گوئی و گزاف
می زدیم از خوب و از ناخوب لاف

طعنه زن بر بیکسان بودیم ما
جز به آزردن نیاسودیم ما

بی سبب صد فتنه ها برداشتیم
هیچ حیله ما درین نگزاشتیم

ظاهرا بودیم خدمتگار خلق
درحقیقت کارِ ما آزار خلق

هر چه می گفتیم از تزویر بود
هرچه بنوشتیم در تحقیر بود

خون دلها این قدر ما ریختیم
قلزم خونین ز دلها ریختیم

مردمان از حرف ما دلریشتر
درد شان از طعنهٔ ما بیشتر

نوك نیش حرف ما دل دوز بود
شعله تشنیع ما جان سوز بود

ما اگر خاریم ور گیاهی شدیم
از مکافات عمل های خودیم

’گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو‘

خار کشته خار ها برداشتیم
’خود غلط بود آنچه ما پنداشتیم‘

بر جراحت شور پاشیدم ما
لوح دلها را خراشیدم ما

ماچنین بودیم مرد هوشمند
رو که از ما هم ترا ناید گزند

این کسان از ما همه بدگو بُدند
بدشعار و عیب جو، بدخو بُدند

در درون ما اذیت دیگراست
رو که مارا صد عقوبت دیگر است‘

خار خار و خونچکان دلریش تر
این چنین گفت و بلرزید آن شجر

خار ها از خار ها چون بر دمید
دست هر خاری بدامانم رسید

چون قدم برداشتم چسپیده بود
در گِلی خار آفرین غلطیده بود

زود گشته آن مکان تاریك و تار
خار هارفت از نظر هم خارزار

سالها بگذشت یا یك لحظه بود — رفتنی بود و بالآخر رفت زود
تیرگی اندر هوا بس می فزود — دردلم بیم از هوا صد پرکشود
لمعه ای چهره کشا ناگاه شد — در هوای تیره ام همراه شد

روحِ بوداآ شکارامی شود

واندیشهٔ خود را که مربوط به فضائلِ هشتگانه می باشد، ابراز میکند

از نکوئی چهره اش تابنده ای — با فروغِ هاله ای رخشنده ای
گفت بامن ای سفیرِ زندگان — دیده ای 'کرما' [1] درین عالم عیان
هرچه باشد از عمل دارد ثمر — از عمل رمز عمل را در نگر
از عملها سلسله دارد وجود — از عمل صد ها ثمر گیرد نمود
جنبشِ موجِ تفکر هم عمل — نقش بستن در تصور هم عمل
ما اسیریم و عمل زنجیرِ ما — حلقهٔ زنجیر هر تدبیر ما
سالها رفت و من از حفظ اصول — داده ام حرفِ عمل را بسکه طول
خوش بیا پیش و مترس از رنجِ خار — وا رهانم تا ترا زین مرگزار
پیش نه گامی که منزل ها بسی ست — گر محیطی هست ، ساحلها بسی ست
این 'شهود' از غیبِ آن عالم بود — ثمره های کارها پیهم بود

(۱) ''کرما'' درعقیدهٔ پیروان بودا هر عملِ ما نتیجه لازمی دارد و مستلزم به پیدائش دیگری بدنیامی باشد۔

جیب هر غیب از گهر های نمود | پر بود چون کیسهٔ کانِ وجود
ای عزیز ، ای ارجمند ، ای نیك خو | چند نکته ها همی گویم بتو
زندگی را صرف یك کاری بکن | علم و عرفان را طلبگاری بکن
فکر را از جهد گردان استوار | تا بدست آری زمام اختیار
رو بگردان از همه، یکسو بشو | جز رهِ دانش دگر راهی مپو
خویش را زآلودگی ها پاك کن | پس حقائق را بخود ادراك کن
حرف نیکو، فکرِ نیکو، کارِ نیك | باکه و مه داشتن رفتارِ نیك
هر عمل تخمیست چون کاریده شد | لاجرم روئیدنش هم دیده شد
راست فهم و راست فکر و راست گفت | راستی را بوئی خوش باید شنفت
راست کار و راست روزی ای پسر | بایدت در زندگانی، در نگر
راست جهد و راست استحضار فکر | راست بودن ارتکازِ ذکر و فکر!
در همه اعمال خیر خویش خواه | تا بود خیرت بهر حالت پناه!"

حرکت بسوی راهِ وادی نما و کوهپایه

احوال مردمان که درجهان بی مقصد زیستند

چون برون رفتیم زان تیره سرا | پیش ما آمد رهِ وادی نما
دور دست از ما یکی کوهِ گران | سر کشیده تا به حدِ آسمان
صد هزاران مرد مان و صد گروه | اندران وادی و هم پائین کوه
کم لباس و بی حواس و پُر هراس | درشمار افزون ز اعداد و قیاس

سو بسو پویان، دوان، ناله کنان / رو بروی یکدگر اندر فغان
جنبشِ اعضای شان بی ذوق رم / لرز لرزان، ترس ترسان دمبدم
حلقه حلقه همچو گردابی به آب / می دویدند از وفورِ اضطراب
بعضی از ایشان بسوی کوهسار / سرزده در وحشت و در اضطرار
کوه پیمایان ولی بی ساز و رخت / مشت زن بر خویش و برهر سنگِ سخت
چون کسی ز ایشان کمی بالارسید / بر سرش سنگی همیں آنجا رسید
کس نبود از دیگری عبرت پذیر / هر کسی در حال خود بودی اسیر
توده ای مردم کسانِ بی بصر / حال شان هر لحظه از سابق بتر
از هجوم آن کسان حیران شدم / این قدر آن مردمان ، حیران شدم
فکر می کردم که اینها کیستند / این قدر مردم بدنیا زیستند!؟
از فراست یافت رهبر راز من / گفت بالبخند : ای دمسازِ من!
این گروه مردم دیوانگان / بی مقاصد زیستند اندر جهان
نی ضمیر اندر شرارِ آرزو / نی به دل اندر چراغِ جستجو
فکر شان را نی تجلی، نی حضور / از حقائق دور و از معنی نفور
محور اندیشۀ شان تن فقط / بی طریق و بی تمیز و بی نمط
بی خرد ، بی فکرِ فردا ، بی خیال / زندگی کردند بی فکرِ مآل
ارزش علم و هنر کم یافتند / زندگی را هیچ کاره ساختند
زندگی دولت بود، نشناختند / مایۀ هستی چه ارزان باختند
کس از ایشان هیچ گه سودی نبرد / زین سیاهان کس بجز دودی نبرد

نا قصانند این همه بی مائگان | گنج هستی داده اینها رائگان
ای پسر ، خوش بین ، جلوروای عزیز | خوش بود زین مردمان کردن گریز
راه دشواراست و بس باریك تر | می شود هر لحظه ای تاریك تر
می رویم ارچند ره دشوارهست | منزل ما در پس کهسارهست!"

درپسِ کوهسار و قلزمِ خونین

از هجومِ آن کسان ما رد شدیم | تاپسِ آن کوه بالامی رسیم
در عبورِ کوه ره دشوار بود | رهبرم لیکن بسی هشیار بود
راهِ ما سنگین و پُراز پیچ وخم | درّه ها تاریك چون بختِ دژم
غار های سهمناك و پُر خطر | از هزاران مار و کژ دم سم اثر
آخرش غاری دهان پیدا نمود | هم هوای سرخگون را وا نمود
در پسِ کهسار بودیم آن زمان | پیش ما یك قلزم خونین روان
قلزم خونین ، محیطی بی کنار | در هوای سرخگون جانها شکار
آن هوا و موجه ای پهنای سرخ | در تموّج بود آن دریای سرخ
موجها با موجها اندر ستیز | در دلِ بینندگان صد حشر خیز
بر کنارِ آن محیطی بیکران | ایستاد آن اوستاد شاعران
آن سنایی شاعرِ "سیر العباد" | که بما صد نکته هایش یاد داد
نکته ها درباره ای آسان روی | در رهِ پرپیچ سیرِ معنوی [1]

(۱) اشاره با سنائی غزنوی وکتاب او "سیر العبادالی المعاد" است۔

گفت بالبخند بامن: ای پسر! دیگر این دنیا ببین ای خوش سیَر
ناگهان یك کشتی ای آمد پدید بر کنارِ قلزمِ خونین رسید
کشتی ای سیمین بدون ناخدا بر کرانه راست آمد سوی ما
رهبرم گفت "ای پسر حیران مشو مرکبی آمد ، کنون راکب بشو!"
با هزار اندیشه و امید و بیم جا گرفتم اندر آن کشتی ای سیم
رو بروی من نشسته رهبرم گفت تا من فکرِ خود یکسو نهم
کشتی ای ما شد روان بی ناخدا اندر آن دریای صد موجِ بلا
گفت از روی کرم مردِ شفیق ناخدای ما خداهست ای رفیق"
رفته رفته آن هوای سرخگون تیره گشت و حال کشتی شد زبون
باد صر صر گشت و تند و بیم ناك جامهٔ اعصاب من شد چا ك چاك
قلزمِ خونین طلاطم خیز گشت موج های تند سهم انگیز گشت
در طلاطم های موجه های خون صد نهنگ و مار سرکرده برون
دریمِ موّاج دو مرد نژند هم شناکردند و دست پا زدند
گه تهِ دریا گهی بر سطحِ آب لطمه ها خوردند با صد پیچ و تاب
سوی کشتی آمدند و رد شدند طعمهٔ کام نهنگِ بد شدند
هر یکی کوشید تا با ما رسد غرقه کرده دیگر او تنها رسد
رهبرم گفت :"این یکی مردك ببین هست الٰهی بخشّ آن مردِ لعین [1]

(۱) الٰهی بخش: یکی از ملازمان آخرین بادشاه تیموری درهند بهادرشاه ظفر که با شاه خود غداری کردو به مکروحیله اوررا به انگلیسیان سپرد۔ شاه ظفر در شهر دوردست 'رنگون' بنام تبعید وزندانی شدو درهمانجا پدرودبه دنیاگفت!

یعنی آن غدارِ قوم خویشتن | با شهِ خود مکر کرده پُرفتن
بو ظفر را سوی 'انگریزان' ببرد | حیف آن شاهی که در رنگون بمرد'
وین دگر دگلس ببینی بی گمان | سرگروهِ لشکرِ انگلیسیان
بود سفاکی بزرگی در جهان | دشمنِ تیموریان و مُسلِمان
صد متاعِ ما بتاراجی ببرد | شهریاران کشت و خونِ شان بخورد
دائما باشند در دریای خون | همچنین غرقاب و بی مرگ و زبون

نوحه ای الٰهی بخش غدّار بر حال خویش

'وای برمن آوخ این آزارِ من | ای دریغ آن شاهِ کم آزارِ من
وای بر آلام آن شاهِ فقیر | کز دروغ و حیله هایم شد اسیر
آن چراغِ آخرِ تیموریان | شد اسیر لشکر انگلیسیان
این همه آوردهٔ من بود ، وای | وای آن غدارئ بی سود ، وای
من کجا و جادهٔ جنت کجا | دشمنان قوم را راحت کجا
آه، این گرداب خونین، جانفشار | دائما در رنجها باشم نزار
ای خدا مارا ازین کربت رهان | لطف فرما و ازین ذلّت رهان
یا بفرما مرگ را تا وا رسد | جان مارا از تن ما برکند
ای خدا ای مالكِ هر دو سرا | رحم کن برحالِ ما ، راحم خدا'
کشتئ ما دور رفت و آن زبون | شد نهان در موجه های بحرِ خون

ساحلِ گرم ریگ

کشتئ ما طی بحر خون نمود — زود ما دیدیم خطی موجی دود
موجِ دودی صورتِ ساحل گرفت — ز ورقِ مادامنِ منزل گرفت
ساحلی بود آن ز ریگِ پا خراش — هم هوایش تند و گرم و ریگ پاش
بر زمینِ ساحلِ گرم و فراخ — نخل های ریشه ریشه ، شاخ شاخ
بی گل وبی برگ و بی نقدِ ثمر — شاخه ها از خارها بس بهره ور
گوی آن یك جنگلِ بی برگ بود — صد خطر آنجا ز بیم مرگ بود
ناگهان دیدم گروهی از زنان — کم لباس و بیخود و گریه کنان
گاه گاهی یك زنی زیشان دوید — سوی آن نخلی کزو خاران دمید
دست زد بر شاخه های پُرزخار — هم کشید او شاخه ها را در کنار
زارگشت و دست وپایش ریش تر — هم جراحت های تن شد بیش تر
رهبرم گفت: "این زنان کم لباس — بی خود و بی اختیار و پُر هراس
این همه بودند در دنیای دوش — بی وفا و حیله جوی و مکر کوش
هر یکی با همسرش بوده، مگر — عشق می ورزید پنهان با دگر
آبروی همسران شان ریختند — جوهر عفت بدار آویختند
هر یکی زین نخل های بی ثمر — هست هر زن را چوآن مرد دگر
مدتی در خارزارِ بی امان — راه پیمودیم مثل رهروان
برکنارِ بیشۀ وحشت بهار — منزلی دیدیم همچو شعله زار

شعله های زردگون وسبز گون — کاندران بودند مردم بس زبون
شعله ها بس سوزناك و تند تاز — هریکی را صد زبانه ها دراز
بادِ سوزان نیز هر لحظه وزید — کاندران صد اخگر از جوشش جهید
اخگر و خاکستر وخاشاك و دود — هر زمان باتندئ دیگر فزود
تازیانه های آن برقِ تپان — آن فغانِ 'الامان و الامان'
آن هوای سوزناك و بی امان — مرگ آنجا همچو یارِ مهربان
شورِ 'هیهات و دریغ و حسرتا' — ناله های 'وای من، ای وای ما'
گفتم ای دانای رازِ این جهان — اندرین آتش کیانند این کسان؟
گفت: 'هستند این همه از منکران — کاذبان و رهزنان و مفسدان
واعظان و ناصحانِ بی عمل — مرشدانِ زور و پیران پُر دغل
شاطران و لوطیان و گمرهان — جملگی از مردمانِ بدزبان''
نیز او فرمود: 'خاطر جمع شو — باتوام من چون، ازینجا خوش برو
هم جلو رو، هم ببین این ماجرا — ما امید خوش بداریم از خدا!''

منطقه ای آتشین

راهِ هر دو مسافر فاصله چند صد سالهای نوری از منطقه ای آتشین داشت ،اما زنده روّد و رهنوّر داین منطقه راخیلی نزدیك حس میکردند بغیراینکه از تابش این منطقه ایشان راهیچگونه گزندی برسد۔

آتش سرخ گون

آتشی دیدم فروزان سرخ گون — گوی بُد تا چرخ یك دریای خون
شعله هایش از زمین تا آسمان — هر زبانه هاش چون کوهِ گران
آتشی پهنا و دردانگیز تر — آتشی سوزان تر و غم خیز تر
آن هوای آتشین ، آن رستخیز — شعله ها باشعله ها اندر ستیز
صد فغانِ الامان و الحذر — اندران آشوبِ آتش بی اثر
مردمان لخت و زنان آتش لباس — از هجوم شعله ها اندر هراس
نی گهی آرام ایشان را نه خواب — التهاب و التهاب و التهاب
آتشین زنجیر و آهن آتشین — دست و پا آتش فشان، تن آتشین
کاسه های سر برون داده دِمار — صد تنِ سوزان و صد روهای تار
موج و دریا اینچنان اندر فشار — شعله ها گرداب و شعله ها کنار
تازیانه ها به پشتِ مردمان — حلقه های آتشین در گردنان
ناله های مردمانِ ناصبور — صد فغان درشعله های نزد و دور
چشم و گوش و دست ها شان دوخته — بعضی ازمردم دهان شان دوخته
جویهای آتشین هرسو روان — مردمان سوخته بر هر کران
از وفورِ تشنگی اندر خروش — هر یکی را گفت گوینده بنوش
چون بنوشیدند ز آبِ آتشین — صد فغان آورد هر آتش نشین
صد جهنم درشکم شان برفروخت — هم درون و هم برون شان بسوخت

”آوخ آوخ، وای وای“ حرفِ شان
آتش ایشان راهوا، آتش مکان

دیدم اندر شعله ای یك تیره بخت
لحظه لحظه پاره پاره ، لخت لخت

جمع گشت و باز پاره پاره شد
لخت لختش در هوا آواره شد

لخت لختش رادگر گونه عذاب
می گرفت و می فشردش التهاب

گفت :”کارِ زشت و کارِ ناسزا
از مکافاتش همی آرد جزا

کارِ من بوده دروغ بی فروغ
قومها را پاره کردم از دروغ

فتنه ها در قوم خود برداشتم
خویش را دانشوری پنداشتم

جنگِ من بی تیغ و بی ساز و یراق
حیلۀ من افتراق و انشقاق

در کمین ملت خود بوده ام
دشمن جمعیت خود بوده ام“

رهبر من گفت بامن ”ای پسر
هم ببین و هم جلو رو زود تر“

اندرون قعر آن خونین مغاك
شعله ای دیگر بدیدم سوزناك

در گرفته بود مردِ لخت را
آتشی بالا و آتش زیرپا

هم گلویش گیر و هم پایش فگار
چهره اش تیره، دهانش پُرزخار

هر قدر می خواست حرفی سرکند
هر قدر کوشید دست و پا زند

دردهانش خارها از نودمید
دست و پایش کج شداز دردشدید

دید چو ما را بسوی ما دوید
زود آمد زود تر از ما رمید

سوی ما دید و زبان خود درید
در کنارش شعله های نو خزید

گفت با من رهبر اسرار بین
این د ژم بخت و سیه رو را ببین

شاعری بود است اندر عهد ما
هر زه گو و دل خراش و ژاژ خا

شاعری بود است بی ساز هنر — کج نهاد و کم سواد و کم نظر
حرف ها بسیار و از معنی تهی — پستی اش بسیار و از اعلیٰ تهی
شاعرانی عصر را کمتر شمرد — از نیاگان خویش را برتر شمرد
شعرها بی خوبی ای ایجاد گفت [1] — هرچه گفت از دانش الحاد گفت

آتشِ نیلگون

در کنار آن مغاكِ شعله بار — راهی پیدا بود بس تاریك و تار
راه بس باریك بود و پرخطر — داشتی از دود و تاریکی اثر
پشت ما پائین آن خونین مغاك — پیش ما یك کوهسارِ سهمناك
لغزشِ یك گام و مرگ ناگهان — چشمکی و پا به قعرِ بی امان
در پسِ آن شعله های سرخگون — آتشی دیگر به صد سوز و فسون
نیلگونش شعله های سربلند — کاندران سختی کشان خوار و نژند
با لباسِ آتشینِ تن گداز — مردمان در طوق و زنجیر دراز
با فغان و گریه های حشر خیز — بانگ زن در شعله های تند و تیز
بانگ زن "از تشنگی میریم ما — قطره ای از آب شیرین و صفا!"
گه گهی جامی ز آب آتشین — پیش شان آمد به حرف خشمگین
چون کسی نوشید حالش شد زبون — از دهانش شد روان صد موجِ خون
گاهی جویی آب آمد پیش شان — سوی آن رفتند با آه و فغان

(۱) چندتاجزوازین سیاق کاسته شد۔

لیك چون رفتند سوی جویی آب | آب خوش گردید ریگ و التهاب
باژ گون بر جای شان زار آمدند | در هوای آتش افشار آمدند
رهبرم گفت :"این کسان کج نهاد | آب را بستند ازروی فساد
مردمان مردند از تشنه لبی | این کسان شادان و خوش از فربهی
درمیان جنگ از طبعِ سقیم | آب را بستند ایشان برغنیم!"

آتشِ سپید

رد شده از آتش آن تشنگان | پیش تر رفتیم سوی دیگران
در پس آن آتش دیگر دمید | شعله هایش بس بلند و بس سپید
شعله ها چو نور و اصلاً نور نی | صورت کافوری و کافور نی
آتشِ سوزان تر و خون ریز تر | صد زبانه هاش تند وتیز تر
هم دران آتش هزاران مردمان | برلبِ شان نعره های 'الامان'
سوختند و استخوانشان هم بسوخت | تندئ شعله روانشان هم بسوخت
مردی از ایشان چوسوی ما بدید | از تهِ آتش بسوی ما جهید
پس ازان افتاد در قعرِ مغاك | پاره پاره ، ریزه ریزه ، چاك چاك
آتشی بگرفتش از هر پهلواش | دست و پا و چشم و گوش و ابرواش
گفت هادی 'این کس و آن دیگران | از گروهی زاهدان و ناصحان
بهر دنیا بودشان حرف و کلام | سیم وزر اندوخته مردان خام
دیگران را پند و اندرز و رشاد | اندرون شان تیره از بغض وفساد

الحذر زین تیره بختان ، الحذر الحذر زین حقه بازان ، الحذر"

آتشِ زمهریر

زان سپس یك قطعه ای آمد پدید گوی بُد یك برف زارانِ سفید
آب برف و خاك برف و سنگ برف پیش و پس برف و هواو رنگ برف
نی شعاعِ مهر آنجا یخ تراش بادِ سرد و تند هر دم برف پاش
صد زمستان پیش آن یخها غلام بی تمازت کاملاً بود آن مقام
زمهریری بود یخ بسته درشت باد یخ آلوده می گوئی کی کشت
آن هوای سرد جسم و جان بسوخت هر چه بود آن را سروسامان بسوخت
راست درجان رفت باد تند و تیز زمهریری بود آن صد مرگ خیز
در رگ جان موج خون خود یخ ببست استخوان از تند ئ صرصر شکست
درمیان وادئ هستی شکار رود یخ بسته بدیدیم آشکار
مردمان دررود برفِ مرگ زا نیم تن در برف و نیمی در هوا
چونکه باد سرد با تندی وزید از تن شان قطره قطره خون چکید
گه گهی بشکست برف رود بار آن سیه بختان دگر گشتند زار
بانگ زد مردی ازایشان 'ای خدا! مرگ را بفرست تاگیرد مرا
تو کجائی ای حریف بی وفا مرگِ من ای مرگ من زودی بیا
ای خدای ما زما پوزش پذیر تشنه لب میریم اندر ز مهریر
لیك خود را زین هوا بردن کجا ما کجا و لذت مردن کجا!"

گفت بامن رهبرِ اسراردان — این همه مردان بدوران جهان
سرد مهر و تند خویان بوده اند — ممسکان و زرپرستان بوده اند
کس نبرده سود ازین سنگین دلان — صد جفا دیدند مردان زین کسان
اندرون شان سوز و دلگرمی نبود — بر زبانشان گفتگو نرمی نبود
این همه سردی ز دلسردیٔ شان — یخ ببست و زمهریری شد ازان!"
نیز فرمود او که "بس، اینهابس است — این قدر نظارگی مارابس است
می رویم از شومیٔ این برفزار — تا بدیگر جایهای خوشگوار

عذابِ مردمانی که اولاد کسان رابامکر و حیله یا بازوراز ایشان جدامی کردند و نگذاشتندکه ایشان حتی از دوردیدار با فرزند یادخترخود بکنند

دره ای دیدیم در کوهِ گران — با رهی بس تنگ و ناپیدا نشان
آن کسان آهسته تر پویان بر آن — پشت هاشان خم تهِ سنگِ گران
اینکه سنگین بار بودند و براه — دیدگان شان گود و بی اشك و نگاه
همچو گاوانی کشیده بارِ سنگ — سست گام و هم درین کرده درنگ
'این کیانند ای سرائر دانِ من — سنگها بر پشت شان و گام زن؟'
گفت: 'اینها مردمان پُر جفا — از کسان اولادِ شان کرده جدا
جائی دلها پاره سنگی داشتند — دیدن بچگان نمی بگذاشتند
هیچ اشكِ مادر و دردِ پدر — با دلِ سنگین شان کرده اثر

نـــی پـذیـرفتـنـد زاری از کســی گـرچـه مـی نـالـیـد پیـش شان بسی
ایـن هـمـان بـاریست که دلها فشرد هـریـکـی درحـال سـنـگینی بمرد،

عذابِ قاضیانِ بی داد گر

جـنـگـلـی دیـدیم از بـس شعله ریز شاخسارش هـریـکی چون تیغ تیز
مـردمـان آنـجـا بـذیـر شاخسار جای سایـه داشتـه صد شعله زار
گـفـتم ایـنـهـا کیستـنـد ای رهـنـمـا گـفـت ایـنـهـا قـاضیـانِ نـاسـزا
قـاضیـان غیـر مـنـصف را ببیـن سـوخـتـه سـامـان و بـس انـدوهگین
در جهـان تخـمِ تظـلـم کـاشتـنـد عـدل نـی کـردنـد و دعویٰ داشتند
بـی گـنـاهان را بـدار آویـختـنـد کـذب هـا بـا کـذب هـا آمیـختند
بیـکســانــی را تـــهِ بـنـدِ گـران داشتـنـد ایـن مـنـصفان انـدر جهان
مـردمــانـی لا تُـعـد مـقـهـور شـان مـردمـان ازدسـت شـان انـدر فغان
عـدل را صـدبـار میـکـردند خون می شوند اینجابصد خواری زبون

.....[اجزا کاسته شد]

بخشِ دوم

برزخِ امثال
(Purgatory of Forms)

برزخ امثال

منطقه ای کیفر و امید

منطقه ای که دران ارواحِ خطاکاران کیفر بینند و امید وارآمرزشِ کردگار هم میباشند زیراکه به دوزخ نفرستاده شده اند

خوش بیا ای ساقئ نیکو صفات — باز بنما از جهانِ ممکنات
باده ای صافی بیار ای مهربان — تانباشد زندگی بارِ گران
داغِ محرومی زدلها پاك کن — شاخسار ما بهارِ تاك کن
از نگاهِ آشنا مدهوش کن — میکشان را میکده بردوش کن
هم دل بیتاب را تسکین ببخش — یك نفس از رائحۀ راحین ببخش
تشنه ای حرفِ تو ام باور بکن — جرعه بخش از خمستان سخن
رهبرِ راز آشنا، پیغام بر — لطف فرمود و بگفتا ای پسر
ممکنات زندگی لاانتها ست — هر مقام آخرینش ابتداست
هر کجا بینی جهانی دیگر است — فرش خاك و آسمانی دیگر است
ذرّه ذرّه صد جهان دردامن است — باطن هربرگ باغ و گلشن است

ای پسر حیران مشو در خود نگر — یك جهان باشد برایت منتظَر
دردلت صد بحر ها اندر خروش — درضمیرت صد جهان حیرت فروش
آتش و گل نغمه ای یك ساز جان — هرنفس پیدا کند صد راز جان
اینکه پیش تست برزخ نام اوست — وقفه ای بین دو حرفِ گفتگو ست

منظره ای سنگلاخی ومردمانِ سنگین لباس

کیفرِ کسانی که راهِ مردمان بستند

چون برون رفتیم زان وحشت سرا — سنگلاخی بس خشن دیدیم ما
راه سنگین و بسا دشوار گشت — جاده ها پرخار و ناهموار گشت
پیش ما آمد گروهی مردمان — سنگ ها را بر رهِ سنگین زنان
خسته و بی جان ولی مصروف کار — راهِ بسته را کشادند آن نزار
زیرِ لب گفتند حرفِ بی صدا — نی گهی از کارشان گشته رها
سنگ دست و سنگ پا و سنگ رو — سنگ چشم و سنگ گوش و سنگ مو
سنگها بر سنگها می کوفتند — پیرهن از سنگها می دوختند
ماجرا جو نزد شان رفتیم ما — باز گوئید ای کسان این ماجرا
'سنگ پیش وسنگ پس، این رنگ چیست — کارِ تان با سنگزار و سنگ چیست؟'
مردی از شان حرف زد: 'ای دوستان — نی سخن ما را و نی مارا فغان
سدّه ای رفت است و حال ما همین — سدّه ای دیگر بباشد همچنین
در جهان ناکردنی کردیم ما — راه ها بر رهروان بستیم ما

رهروان از چیره دستی های ما — زار و دلتنگ آمده ، ای وای ما
کارِ ما خارا شگافی حالیا — راه بسته را کشادن بار ها
لیك چون امید عفواز آن شه است — می کنیم این کار ار باشیم پست!"
این شنیده از گروهِ سنگ تن — رهبرِ فرزانه ام گفتا به من:
'گام زن تا زین ره سنگین رویم — راه پیما سوی منزلها شویم'

الم کده ای فراق و هجران زدگی

سیفوء[1] شاعرۀ یونانی

در عالم فراق از دخترانِ خوشگلِ جزیرۀ لیسباس

ردشده از آن مقام و آن مکین — جائیگه دیدیم بس اندوهگین
وادی ای معمور از درد فراق — صد زبونی ها دران اندر وفاق
عرصه ها از تشنگی بی آبمر بود — قطره ای آبی دران نایاب بود
اندر آن ویرانه افزون دمبدم — حزن و اندوه و ملال و یاس و غم
نخل ها بی برگ و بی بار و عقیم — اندر آن وحشت سرا دلها دونیم
موجه های دود ها از پیش و پس — حلقه حلقه دود ها از خار و خس
گرم بود آن وادئ پُر احتراق — از فغانِ الفراق و الفراق

(۱) سیفو شاعره ای یونان قدیم که درجزیرۀ لیسباس زندگی می کرد و بادختران خوشگل عشق می ورزید و دروصف جمال آنها غزلهای عاشقانه می سرود ،درپایان عمر از کوه بلند جست کرده پدرود بجهان گفت۔

در یکی از قطعه های بی نصیب / یك زنی دیدیم بی ساز شکیب
آن زنی چون ماه سیمیں پیکرش / صد بهارِ خوش گلی اندر برش
جعدِ مشکینش کمندِ هوش و جان / چهره از آب حیاتِ جاودان
دلبری، عشوه طرازی، ساحری / نکته آموزی بروحِ شاعری
ساعدِ سیمین و دستِ زرنگار / رهزنِ ادراك و جان و دل شکار
چشم او افسونِ صد حیرت فروش / یك نگاهش صد چمن عشرت فروش
گاه بنشست و گهی برخاست او / ماه بود و لحظه لحظه کاست او
تخم جان در خاك آن ویرانه کاشت / بر هوا حرفِ ملال آگین نگاشت
گفت: 'ای وای فراقِ دوستان / ای فراقِ دوستان مهربان
ای دریغ آن صحبتِ جادو اثر / ای دریغ آن دخترانِ سیم بر
آن پریّ ، آن مهروشّ، آن گلبدنّ / وان دگر ناظورهٔ زرّینه تن
آن سلیمآ، آن فریحهّ، آن بهآر / آن گروهِ دختران گلعذار
آن همه خوبان که یارم بوده اند / در گلستانم بهارم بوده اند
آن نگارم، آن منیژه، آن پری / کوکبی از آسمان دلبری
آن لبِ میگون و آن گفتارِ او / آن قدِ بالا و آن رفتار او
ای خوش آن روزی که بودی در برم / صبحگاهان خاستی از بسترم
خاستی چون شاخِ گل از فرش گل / باسیه مستی ای صد خم خانه مُل
وای آن بوسیدنِ دستِ نگار / وای آن گل چیدنِ بی رنجِ خار
ای خوش آن حرفی که صد پرایه داشت / عشق نخلی بود و بر ما سایه داشت

خوش بیا تو ای بتِ طنازِ من ای رفیق و هم‌دم و دمسازِ من
تشنه می میرم درین صحرا، بیا سوخته سامانم ای دریا بیا
در خزانم ای بهارِ من بیا بی تو مانم ای نگارِ من بیا
خوش بیا ای دخترِ فرخنده بخت از فراقت پیکرم شد لخت لخت
ای بهارِ زندگی رعنائی ات خوش بیا با آن همه زیبائی ات
تا ترا تنگت بگیرم درکنار خوش بیاای آرزوی جانِ زار'
یك بیك دیدم که اندر آن فضا لمعه ای رخشید با صد ماجرا
زود تر آن حلقه ای تنویر شد هم دران صد خواب ها تعبیر شد
از درونِ حلقه ای نوری قماش یك گروهِ دختران شد نورپاش
دخترانِ خوش گل و زیبا و چست باهمه اسبابِ محبوبی درست
هر یکی زان نازنینان خوب تر هر یکی از دیگری محبوب تر
دختری زان جملگی ایمان شکار خنده زن بر حالتِ آن بیقرار
گفت: "سیفو! بین که اینك آمدیم آمدیم اینجا و یك یك آمدیم
اندرین ویرانهٔ کهنه رباط خوش بیای و گرم کن بزمِ نشاط'
چون زنِ مهجور حرفِ شان شنید سوی ایشان دید و سوی شان دوید
خواست چون بکشد یکی را در کنار یا بگیرد دستِ یك سیمین نگار
آن گروهِ دختران شد ناپدید جای ایشان شعله ای پیچان دمید
آن زنی بر خورد با آن شعله ای شعله اش بگرفت همچو حلقه ای
سوخته در شعله بی آه و فغان ماند یك لحظه زخود آتش نشان

زود بـادِ خـوشگـوار آنجـا وزيـد چـنـد بـرگ و چـنـد بوته هم دمید
گـفـت گـوينده كه 'اى برگِ خزان يـعـنـى سيفو، عـاشقِ زيبا رخان
شـاعـرى بـودى و مـجـنونهٔ جمال ليك ورزيـدى نـه عشقِ لا يـزال
تـو كـه خـود زيبا بُدى و خـوبرو دل بـه زنهـا بستـنت خوبى نبود
چـونكه حسن از شعبهٔ خير آمد ست در مـجاز اما نـه جز غير آمدست
اى فـرامـش كـار، اى شعر آفرين نـفـىِ خود كردن نشايد اين چنين
در هـوس پـروردنِ ذوقِ سجـود جز خطاى قلب و چشم و جان نبود
مـنتظر مـى بـاش تـا مـس زر شود لـطفِ حـق از لـطفِ او رهبـرشود'

باغِ ويران زنِ زيباى از ديارِهند

مـنـظـرِ نـو يك بيك آمد پديد بـاد گـرم و سـرد آنجا مـى و زيد
جـا گـرفتـه بود زيرِ يك درخـت دخترى زيباى بى سامان و رخت
دخترى مـه طـلعتـى گـل پيكرى خـوش گـلـى نـاز آفـرينى دلبرى
يك نـگـاهِ نـاز او عـالـم شكـار پيـكـرِ سيمينـش رشكِ صد بهار
صد خزان ز افسردگى هايش دميد زار مـى نـالـيـد و آهِ غـم كشيـد
سـنـگپـاره بـود تـختِ آن نـگـار مـحـوِ درد خـويشتن بـود و نـزار
اشك از چشمـانِ جادويش روان درد هـا از طـلعـتِ خوبش عيان
هـم كفِ افسـوس مـى مـاليد او هـم ز وحشت سـو بسـو مى ديد او
تيـر مـژگـانـش گهر آلـود اشك مـوى پيچانش به رو چو دود اشك

پیرهن نی لیکن همچو پیرهن | یك لباس زرد گون زیبِ بدن
آه می کرد و بگفت 'ای وای من! | وای بر سوز و جراحت های من!
آه، آن سنگین دلانِ بی وفا | وای آن یارانِ پُرمکر و جفا
وای ایامی که من می زیستم | وای این شبها که می بگریستم
وای طولِ عرصهٔ ده صد سنین | کاندرین ویرانه می باشم مکین'
این بگفت آن دخترِ آئینه رو | بادلِ آشفته و آشفته مو
نزدِ او رفتیم بهرِ حرفِ چند | هم بگفتیم "ای عزیز ای درد مند
تو که خود یك پاره افسونی، چه شد؟ | اندرین ویرانه این چونی، چه شد؟'

حکایتِ آن زنِ هندی

گفت با صد آه و با صد اشكِ غم | نامِ من ممتاز و دخترِ هندی ام
میهنِ من بود شهرِ ساحلی | ای خوش آن سرچشمهٔ صد خوشدلی
همسرم بوده جوانِ خوشگلی | خوش کلامی، خوشخرامی، کاملی
عشق می ورزید بامن آن شکیل | حرف و کارِ او زعشقِ او دلیل
روزوشب گفته بمن 'ای جانِ جان! | زیستن بی تو نمی دانم چسان
حاصلِ صد آرزوی من توای | زندگی ، ای ماهروی من، توای'
روی و گیسویم ببوسید وبگفت: | کی توانم از تو راز دل نهفت
ای سیه موی من ، ای فرخنده رو! | تو منی ، من تو ، ولیکن توای تو'!
ازدواجِ ما بیك سال اینچنین | بود چون کیفِ بهارِ اولین

ناگهان درعینِ عهدِ خرّمی / من شدم ناخوش ز سرما خوردگی
رفت یك دو روز و رنجوری فزود / حالِ من بدتر بشد زین گونه زود
طاقتِ رفتار رفت و خواب رفت / کشتی ای جانم بصد گرداب رفت
یك دو هفته رفت و حالم شد تباه / نی بیداری نه در خوابم پناه
همسر و تیمارِ من در بندِ غم / کم بخورد و کم بخوابید از الم
از اطاقم رفته زود آمد که 'جان! / جز به دیدِ تو مرا راحت چسان'!
گفت: 'زود ای جانِ من بهتر شوی / گر خدا خواهد همان دختر شوی
دخترِ زیبا و خوش اندام و چست / کارِ تو خواهد شد از ایزد درست
ای گل اندامِ من ای تو یارِ من / ای عزیز، ای اندك و بسیارِ من
کاش من بیمار تو فرحان شدی / کاش من در رنج و تو شادان شدی'
این بگفت و دست من بوسید او / از خیالِ من بسا رنجید او
یك شبِ تاریك بود و غم فزا / همسرم را گفتم "ای جان، زود آ
گوش نزدیكِ لبم آر و شنو / حالِ من گشته تبه، از من مرو
گر بمیرم، ازدواجِ نو بگیر / من بمیرم، تو بفرطِ غم ممیر!"
گفت 'ای جان، زنده باشی زنده باش! / بر دلم زین روی زیبا نور پاش
گر بمیری (ای خدا، یاری بکن) / گر بمیری (ای دریغا، این سخن)
گر بمیری کی توانم زیستن / بی تو باشد مرگ، جانم، زیستن
تو مپنداری که من سنگین دلم / ازدواجِ نوکنم گر، کافرم!"
او همی گفت این سخن ها از الم / درتنم افزون شده صد رنج و غم

من رخِ اومی بدیدم ، جان برفت
کار مشکل بود، لیك آسان برفت!

گفت گوینده که ”ای فرمانبران
دخترك را کم رسد ایذای جان

در جهان بازوجِ خود کرده وفا
کم نبوده در وفایش ماجرا

چونکه این خوش منظرِ تمثال جو
عشق می ورزید با هر خوبرو

گو که در عکس و تیاتر بد چنان
کیفرش می باید اندر این مکان

بعدِ ده سال از خدا بخشش بود
وین کرم از حضرتِ داور بود!

منتظر باشد که تا آید خبر
گر خدا خواهد همین گون زودتر!“

هفته ای ماندم درین ویران سرا
تا بدل جوشید عشقم (ای خدا!)

یادِ آن یارِ عزیز و مهربان
هر نفس افزود رنجِ بیکران

گفتم: ”ای بارِ خدا، ای کردگار!
مرحمت کن بر من ای آمرزگار!

فرصتِ یك روزه بخشی یاربم
تا به شهرِ همسرِ خود می روم

آرزو دارم که بینم چون بود
همسرم بی من چسان دل خون بود

امر کن از لطف بافرمانبران
فرصتِ یکروزه بخش ای مهربان‘

گفت گوینده: ”اگر خواهی چنین
رو ولیکن شرطِ رفتن هست این

چون دگر بار آئی اندر این جهان
انتظار تو شود صد گون گران

گر روی، کیفر دگر دنبال هست
مدتِ ده سال یکصد سال هست‘

گفتم: ’ای پوزش پذیرِ عاصیان
می روم اینك بسوی آن جهان

دیدنِ روی عزیزان خوشتر است
’ای خوش آن شهریکه آنجا دلبرست‘

قیمتِ دیدِ عزیزان بیش نیست
مدتِ صد سال اینجا بیش نیست‘

زود رفتم زین جهان تا آن جهان — هم رسیدم تا به شهر دوستان
شهر ساحل، گلشن مینو سواد — آن دیارِ دوستانِ خوش نهاد
درشبِ مهتاب رشك صد بهار — هم شبستان ها چو فصل مشك بار
خانهٔ ما و آن بهارِ خانه باغ — بود بقعهٔ نور با صد چلچراغ
همسرم را یافتم آنجا مکین — با زنِ عشوه گرِ ناز آفرین
در پسِ یك سروِ پر برگ و دراز — ایستادم تاکه شنوم حرفِ راز
زن همی گفت 'ای عزیز، ای جانِ من — ای گل و باغ و سروسامانِ من
زوجِ تو در هفتهٔ رفته برفت — هیچ گه یاد آری آن برگشته بخت؟"
شوهرم بیزار شد از ذکرِ من — از تکدر گفت "ای سیمین بدن
آنکه بوده روز و شب بیدار رفت — شکرِ ایزد آن زنِ بیمار رفت
عشقِ من اکنون توای، جانم توای — جانِ جان ایجان و ایمانم توای
ای سمن بر، ای پری، ای ماهرو — کم بگو، از رفتگان کم تر بگو!"
این قدر گفتارِ او بس بُد مرا — زود تر برگشتم اندر این سرا
ساعت دیدِ چنان زخم نظر — بود از صد سال اذیت ناك تر
اکنون آن صد سال و این ویرانسرا — این قدر هست از نصیبم ماجرا'

پرتوستان

منطقهٔ آخرینِ برزخِ امثال که از انوارِ حقائق و افکار عالیه متفکرین و نویسندگان جهانی روشن است

زان گذشته عرصه ای دیدیم ما — وحشت آنجا بس کم و هم پُرفضا

آن هـوای روشـن و چـرخِ کبـود | عـقـده هـای خـاطـرِ مـا وا کشـود
رهبرم گـفـت "ایـن مقامِ کم سرور | نسبتـی دارد بـه اذواق و شعـور
از فـروغِ فـکـرِ عـالـی روشن اسـت | وزپئی اربـابِ معـنی مأمن است
ایـن مـکـان است از برای آنکسان | کـز تـجـلـی هـای حسنِ بی نشان
بهره ای بـرده، ولـی انـدر حجاب | مـوجِ شـان لیکن نمی گردد سراب
نـغـمـه ای ایشان زسازِ آگهی ست | حـرف های شان زرمزِ معنوی ست
لیك وامـانـدنـد انـدر راهِ دوسـت | دورمـانـده از تـجـلی گـاهِ دوست
بـاهـمـه دوری و فـکـرِ نـا رسـا | راز هـا دارنـد در حـرف وصدا"

منطقه ای که قرینِ باغِ جاودان است و مقام مردمان خوش بین وحقیقت شناس که امیدوارِ پرتوِ جمالِ ایزدی هستند

شه بـلـوطـی دیـدم آنجا بس بلند | شـاخـه هـایـش بـرگ دار و بارمند
زیـرِ آن پُر بـرگ و پهناور درخـت | خـیـمـه و خـرگـاه را سـامان ورخت
یك گـروهِ عـاقـلان و بـخـردان | زیـرکـان وز رازِ هستـی آگهـان
مـحـو در گـفـتـارِ نـغـزِ یك دگـر | از سـخـن هـا شـان مـعـانـی معتبر

منتظرانِ پرتوِ جمال

یك بیك دیـدم فـروغِ دیـگـری | از جهـانِ دیـگـر و روشـن تـری
جـائیـگـاهِ دلکشا دیدم پدید | کـانـدران هرلحظه گلها بر دمید
انتـظارِ جلوه ها خود جلوه ایست | آرزوی نـغـمـه ها خود نغمه ایست

مردمان بودند آنجا خوش نظر — چهره ها شان روشن و پرنورتر
گه تفکر بود زیشان آشکار — گه تکلم بود ایشان را شعار
هم تکلم را تفکر یار بود — بزم شان چون گلشنِ بی خار بود
حرف ها دارای معنی های نو — هر سخن را پیش رس آوای نو
نسخه ها کم کم سخن را همصفیر — جلوه ها گه گه دران صورت پذیر
نور و رنگ و صوت و آهنگ و نوا — با تفکر چهرهٔ معنی نما
آن گزیده مردمانِ خنده رو — در سخن بودند گه آشفته هو
هر یکی زیشان چو آمد در خطاب — از رخِ معنی برافگنده نقاب

شیکسپیئر

شیکسپیئر آن دراماتیك زاد — در درامِ زندگی بودش نهاد
شاعر دانا، خداوند هنر — نکته دان سیرت نوع بشر
عشق و رشك و رحم وخشم وانتقام — درد و داغ آرزوی ناتمام
عشرت نا پائیدار و زود رو — دولتِ نا استوار و زود رو
خنده ها و اشك هائ خون چکان — نقش بند صورت هر داستان
مصرعِ نظمش به صد دیوان حریف — نقطهٔ حرفش بهر عنوان لطیف
شیوهٔ و آهنگ و ترتیب کلام — معنی و الفاظ را نقش دوام
در درامش دانش آموز بشر — در نمائش ها ادیب نکته ور
شاعر ژرفا، حکیم روزگار — ساحر جادو بیان جادو نگار

عـــارف دنیـــا و معـروف جهـــان ابتـــکـــار آمـــوز و خـلاق زمـــان
از نـمائـش نـامـه هایـش درحیات سطـر سطـرش ترجـمان حادثات
نـقـــش بـنـد حـادثات و واقـعات رازدان زنـــدگـــی بـــی ثبـــات
رهبـرم گـفتـش کـه’ای راز آشنا ایـن رفیـقـم بـاتـو دارد مـاجرا‘
سـوی مـادید و بگفت ’ای دوستان خـوش بیـایید ای هـنـر وابستگان‘
بـاز بـا مـن گـفت آن فرخ نهاد ’ای سـفیـر مشـرق و مشـرق نژاد
بـاز گـو از آن جهـان آب و گـل بـاز گـو از دوستـان وحـال دل‘

رهنورد

گفتم: ’ای سرخیلِ نقاشانِ جان هـم چـنیـن ست آنجهانِ گلرخان
آن کـرشـمه های خوبان همچنین عـاشـقـان را دردِ حـرمان همچنین
هـمـچـنیـن غـدّارئ اربابِ کیـن سفـلـگان را حیله جوئی همچنین
داغ داغِ آرزوی نـــاتـــمـــام هـمـچـنیـن بـر سینـۀ مـردم مدام
خـنـده زن تـقـدیـر بـر انسان چنین چشمِ هـر بیننده ای حیران چنین
بـاز گـو ای داستـان گـو بـاز گـو آدمـــی را در جهـــان آرام کـو‘

شیکسپیئر

آدمـی آن گـوهـرِ یـکـدانـه ای آن خـرد افـروز، آن افسـانـه ای
آن فـروغِ مشـتِ خـاكِ بیقـرار آن جهـــانِ رنگ را تـــازه بهـــار
آن اسیـــرِ نشّـــۀ سـود و زیـــان آن رهیـن ورطـۀ عـلـم و گـمـان

قهـرمـــان داستـــان زنـدگیســت بازی گر هست و سخن آرا بسیست
صحنهٔ یك داستان است آن جهان کاندران این قهرمان[1] بازی کنان
گاه مـی خـنـدد گهی گریان شود گـــاه از هـر چیـز رو گـردان شـود

ایمرسن متفّکر امریکائی بسخن در می آید

اے عـزیزان زندگی یك خنده ایست شـکـوه و اشك وفغان و رنج نیست
خـار اگرچه هست گلها هم بسی است دیدن و برچیدنِ گل زندگی است
زیستـن بـــه اســت از نـــا زیستن گـرچـه بـاشـد بـے سر و پا زیستن
باغِ هستی اینـقدر پُر خار نیست ای عـزیـزان زیستن دشـوار نیست
گـر بـدل دارید بر نیکی یقین شیشـــهٔ تـــان پُـر شـود از انـگیـن

کانت فیلسوف آلمانی

گرچـه آدم صـانع و خلّاق هست زنـدگـی را آبرو ز اخـلاق هست
بی شعورِ خیر و شر جان هیچ نیست ارتـقـائ نـوعِ انسـان هیچ نیست
آدمـــی دارد شـعـــورِ مستـنیـــر بـایـد انسـان پاك دارد این ضمیر
آدمـی بـی روشـنـائی از ضمیر در سـرابِ زنـدگـانی تشنـه میر

نطشه شاعر و حکیم آلمانوی

وای بـــر آن آدمِ واژون نهـــاد آن اسیـــرِ روزگـــار و امتـــداد
هـمچنان در بندِ اوهامِ خود است بـی خبـر از رمزِ ایّامِ خـود است

(۱) قهرمان: بطل جلیل: Hero

فطرتش نامحکم و نا استوار — همچنان بی آرزو بی اختیار
گوهرش راهیچ تر از سنگ ساخت — جوهرش را پُر ز دود و زنگ ساخت
ساحری ورزید و اعجازش نماند — شهپرش بشکست و پروازش نماند
زیرِ دامِ ناتوانی خسته ای — آدمی صیدِ زبونِ بسته ای
آدمی خود را نه داد از خود نشان — ای دریغ آن آدمِ ننگِ جهان

جهانِ نو

ناگهان دیدم جهانِ نو پدید — کاندران هر لحظه گلها بر دمید
آن جهان روشن تر از خورشید بود — معنئ نو دمبدم چهره نمود
امتزاجِ جلوه ها خود جلوه ای است — آرزوئ نغمه ها خود نغمه ای است

برگسان

متفکّر فرانسوی که زمان را سرِّ حیات و اصلِ موجودات قرار داد و وجدان را از عقل بر تر گردانید

زندگی در شور زارِ آب و گل — عمر ها ماند است خوار و مضمحل
جامد و نامی و حیوان دیده است — خار و گل از باغ و صحرا چیده است
راه پیمود از جبلّت تا خرد — تا جدا گردید از مرغان و دد
بر فروغِ عقل هم رنگی فزود — از درونش چهرهٔ وجدان نمود
زندگی پیوسته در جهدِ بقاست — راه بسیار است منزل ها کجاست

از درون خویش گردد آشکار — نشۀ صهباش بی رنج خمار
زندگی در خویش ادراكِ زمان — زندگی تعمیرِ یك آفاقِ جان
زندگی را سوز و سازی دیگر است — این سجود و این نمازی دیگر است
دیر و زودِ زندگی نوع دگر — این شرار آگهی نوع دگر
ممکناتِ زندگی لا منتهاست — هر نهایت نقطۀ یك ابتداست
حرف و معنا، جان و تن، غیب و شهود — یك حقیقت را بود ذوقِ نمود
سازِ هستی را نوا بسیار هست — شاهدِ معنی بسا پُر کار هست
گر دلی داری بده زانش نشان — باز نو ساز این زمان و این مکان

گوته، شاعر المانوی

شاعر آلمانوی که حافظِ شیراز را از بس ستوده و چندی راهِ حق هم پیموده و منظومۀ بعنوانِ "زنده رود" در بارۀ پیغمبرِ اسلام علیه الصلاة والسلام سروده بود، در سخن می آمد

شاعر المان گوته نامور — داشته در گوشۀ گلبن مقرّ
چونکه مدحِ حافظِ شیراز گفت — هم درینجا ایں درِ معنی بسفت
گفت آن مردِ بلند آوازه ای — 'این سخن از ماست برگ تازه ای
شعرِ تو همچو ابد از بس بزرگ — از تو آمد اینقدر کارِ سترگ
در بلندی شعرِ تو چون آسمان — گنبد آسا محکم و فرّخ نشان

مطلعت با مقطعت با یکدگر — سر بسر هم سنگ در لطف و اثر
هر یکی زان آیت حسن و جمال — هر یکی زان از نشاناتِ کمال
روزی گر دنیا بسر آید چه باك — من کنارِ تو بباشم چست و چاك
با تو صهبا می بنوشم همچو تو — عشق و رزم با نگارِ رزم جو
افتخارِ زندگی یارت شدن — اهتزاز قلب و جان با تو بُدن'

باز گوئی کردنِ گوته در مدحِ نطشه

بحضور حافظِ شیراز

'آن فکور مبتکر از آلمان — همچو در مدحِ تو گفته اینچنان
[نیطشه را چو درینجا بار نیست — همچنانش فرصت گفتار نیست
لیك می دانم بعالم بعدِ من — او درین معرض بگفته هم سخن:]
'حافظا! میخانهٔ از حکمتت — خوش بنا کردی بباغِ دفترت
در بلندی بیش از کاخِ جهان — بادهٔ لطفِ سخن هر دم روان
باده ات بیش از خیال مردمان — تابِ نوشیدن ندارند این کسان
جز به سیمرغِ سمر در داستان — کس به بزمِ تو نه باشد میهمان
گر چه فانی بوده ای اندر جهان — جاودانی نقش را کردی عیان
آتشی کت از کمال افروختی — چون سمندر خویشتن را سوختی
لیك کامل تر بیائی از گداز — با خیالاتِ عظیم و حرفِ راز
میکده ما را توئی، هم باده ای — منزلی ما را توئی هم جاده ای

مستئ صهبای تو تندست و تیز | بادۀ انگور چون خواهی تو نیز؟‘
باز گفت آن شاعرِ شیرین بیان: | ’اینچنین حالم که می بینی عیان
در جهان یك كار نیكو كرده ام | باغِ روحِ خویش خوشبو كرده ام
تخمِ خیر اندر دلِ خود كاشتم | اسم احمد را گرامی داشتم
نامِ آن سرور گرفتم ’’زنده رود‘‘ | بر روانش صد سلام و صد درود!!‘
رهبرم گفت:’ای پسر رخصت شویم | سوی خلد و گلشنِ جنَّت رویم‘
كشتئ زرّین و دریائے گهر | فرصتِ سیر و تماشای و نظر
آن نمودِ ساحلِ جنَّت نشان | آن كشودِ خاطرِ ما رهروان
رنگ از گل، گل ز شاخه ها چكید | آن سوی دریا جهانِ نو دمید

(جزودوم مثنوی فرخنامه به عنوانِ برزخِ امثال به پایان رسید)

بخشِ سوم

فردوسِ جمال

(The Paradiso of Beauty)

فردوسِ جمال

ای خدا ای مالك هفت آسمان — ای که گشتی از نهان بودن عیان
من کجا و این مقاماتِ بلند — من کجا و کاملانِ ارجمند
چونکه بخش سوّمیں آغاز شد — رحمتِ حق هم بما دمساز شد
فضل جوید ناقصانِ راه را — بذل جوید کاملانِ راه را
نورِ تو طالع زهر بام و دراست — منکران را کی ولیکن باور است

"ای خدا بنما تو جان را آن مقام
کاندرو بی حرف می روید کلام"

باز هم آگه کنی از راز ها — رمزِ ربطِ حرف و معنی وانما
گر نفس آواز گردد، چون شود — چون ازین صد حرفها موزون شود
حرف را آئین گفتاری که داد — گفتگو را ربط و رفتاری که داد
حرف معنی می شود در استماع — معنی پیدا می شود دراجتماع
حرف ومعنی سرّی از اسرار هست — هردو را یکجائی درگفتار هست
نورِ معنی رهنمای گفتگو — معنی را آرد بیانش رو برو
حرف و معنی هردو را از تو وجود — گر بود آن را نمود این را شهود

ای خدا! ای مالك ارض وسما
اعتبار افزائی این حرف مرا

ساحلِ گلفرش و آغازِ سفر سوی بهشتِ جمال

کشتیِ سیمین بدریا باز گشت — آن سوی دنیای افسون ساز گشت
نی هوا تاریك و نی دود کثیف — ساحلی بوده هوایش بس لطیف
آسمان پهنای و بهجت آفرین — هم زمین گلپوش و راحت آفرین
از فزونی گل ز گل ها بر دمید — بادِ عنبر بو بهر سو می چمید
سرو ها بالیده و خوش خاسته — نخلهای بارور پیراسته
نخلها هم صف به صف هم در گروه — بارمند و سر بلند و پرشکوه
قمریان را نغمه از حق سرُّه — نرگسان را صد تماشا روبرو
طایران آواز خوان پرّان و مست — از فروغِ رنگِ گل خندان و مست
رهبرم گفت: "ایں بهارِ جاودان — شکرِ ایزد کن که می بینی عیان
حرف و ادراك اندرین عالم دگر — صورت اشیای و کیف و کم دگر
جلوه گاهِ قدسیان است این بهشت — هم برای نیکوان است این بهشت
رفته و آینده این جا هم بر است — تن روان ست و روان چون پیکر ست
هر چه می بینی نشانِ ابتدا است — مبتدا هست و خبر لا منتها است
این بهار از عالمِ ایجاد هست — ذرّه اش از مهر ها آباد هست
آرزو را کاوشِ تکمیل نی — جستجو را کاهشِ تعجیل نی
فرصت و تعجیل اینجا دیگر است — خواهش و تکمیل اینجا دیگر است
نی غمِ نایافت اینجا نی ملال — هر جمال اندر کمال و لا زوال

هر خیال اینجا وجود است ای پسر — غیب ها اینجا شهود است ای پسر
راستی این جلوه گاهِ دوست هست — راه اینجا صرف راهِ دوست هست
خوش بیا تا سیرِ این دنیا کنیم — سیر در امروزِ این فردا کنیم

دروازۀ زرّین و در پسِ آن دروازه

جادۀ گلفرش بوده راهِ ما — صد طلسمِ رنگ هر سو پر کشا
جادۀ گلفرش وصحنه هائے نور — صد تجلی پیش وپس از نزد و دور
ناگهان دیدم که جای دیگر است — رنگ و بو دیگر، هوای دیگر است
یك جهانِ روشن و رنگین بهار — شه دری آراسته ، گوهر نگار
لیك بی مردم بدیدم آن جهان — پیشوای من، حکیمِ رازدان
'زانچه بینی ' گفت 'ازو حیران مشو — زین سرای کاخ وکو حیران مشو
این بهشت بی مکین فردا بود — از برای مردمان بر جا بود
مردمان کاندر جهان در خدمت اند — حاصل صدکشور و صد دولت اند
ظاهرا بی اختیار و بی نمود — کارِ انسان را مگر زایشان کشود
فکرِ ایشان بهرِ دلداریِ خلق — حرف ایشان بهرِ بیداریِ خلق
بی ریا، بی خواهش داد وستد — جاودانه مستعد بهرِ مدد
بهترین مردمان هر زمان — آفرین بر کارِ ایشان در جهان
این قصورو باغ و راغ وبرگ و بر — اهل خدمت را بهشتِ منتظُر

مقاماتِ مردمان دائم الحال

جای مردمانی که درحالت ها خوشنود اندکه در عالم آب و گِل خوششان می آمد

زان گذشته وادئ دیدم پهن — کرده آنجا صد بهار نو وطن
هم دران صد قصر و کاخِ سیم وزر — کاندران مردان خوش کرده مقر
هر یکی در حالتِ مطلوبِ خود — هر یکی محبوب و هم محجوب خود
هریکی را صد مقال اندر خیال — هر یکی احوالِ خود را خود مثال

نموداری فیلسوفِ اندلسی ابنِ رشد

دیدم آنجا مردِ خوش وضع وجلیل — روی او از دانش محکم دلیل
ابنِ رشد، آن قاضیِ حکمت مآب — برگ برگ گل برای او کتاب
در لباسِ غربیانِ مسلمان — خوش بداد از دانش و دینش نشان
صد صحیفه از ارسطو پیش او — دانش او پیش او چون کیش او
قِدمتِ ارواح و عالم را چنان — معتقد بود آن حکیم بی گمان
ملحدش گفتند او را آن زمان — مفتیان و خاص وعام وعالمان
از تصانیف ارسطواش نشاط — داشت آن دانشور حکمت بساط
چون بری از شرك بود و از نفاق — باجمیعِ مسلمان بودش وفاق
یعنی دینِ مصطفیٌ نگذاشت او — دین قیّم را مسَلّم داشت او

هم نماز پنجگانه کرد ادا / هم به مسجد رفت و می خواندی دعا
هم بگشته مقتدی اندر نماز / دررکوع و در سجود و در نیاز
روزی با فرزندِ خود اندر دمشق / رفته درمسجد بذوق و شوق و عشق
از گریبانش کشیدند و ز پس / بادرشتی های مفتی و عسس
از درِ مسجد همی راندند شان / تا نباشد درجهان شان رانشان
پلّه پلّه چون همی افتند پس / کس نمی آمد به ایشان داد رس
گفته ابنِ رشد باری باکسان / ”من ز روزِ واقعه گویم چسان
درد و رنج و اندهان بسیار بود / هیچ کس با ما نه خویش و یار بود
صبر می کردم که جز صبرم نبود / عقدهٔ ما را دران ورطه کشود
پس به آنجا ذلت و نقصان من / شد باین جا عزت و غفران من
چونکه باشم من باین جا شاد کام / پس سخن کوتاه باشد، والسلام‘

ابن ر شد درمدح عقل ودانش

لیك من باید که گویم حرف حق / تا بود اهلِ خطا را خوش سبق
عقل ودانش حاصلِ مرگ و حیات / عقل رازِ اعظمی در کائنات
عقل و وجدان هم سرِ یك دیگر اند / زندگی بحراست و هر دو گوهر اند
’گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر‘ / هرچه خواهی از درِ حکمت بگیر
عقل انسان را نماید نیك و بد / عقل روی آدمی را خال وخد
عقل را روشنگرِ هستی بخوان / عقل را آشوب وسرمستی مخوان

عقل شاهان را سبق آموز گشت — عقل شبهای کسان را روز گشت
هر که هر بنیاد را محکم نهاد — از کلید عقل بابِ او کشاد
آن اساطینِ خلافت در جهان — عاقلانِ کاملان بودند، هان!
عدل را میزان عقل ودانش است — فهم را برهان عقل ودانش است'
رهبرم گو این سخن ها خوش نکرد — چندی ساکت ماند وگفت آن رادمرد

زنده رود

هر چه گفتی گرچه بامن ساز نیست — لیك جز رمزِ دقیق وراز نیست
عقل تو هم عشق تو شد ای هژیر — شورشِ عشاق را کم تر مگیر

مقام شیخِ اشراق

شیخ شهاب الدین سهروردی مقتول

مردی دیدم درلباسِ سهرورد — گوئی او مشق سخن رانی بکرد
شیخ اشراق آن شهاب الدین قتیل — می شنید او پر زدن از جبرئیل
زین سبب از پرپرِ او قصه خواند — بارها در عالم حیرت بماند
این چنین گفت او که گوئی نظم گفت — لوح خاطر رابصد خوبی برفت
حال آن صوفیِ صافی آن زمان — صد طنین انداخته تسبیح خوان
گفتهٔ او بود از نوع دگر — حمد خوان درنثر چون نظم درر

شیخِ اشراق

آدمی اندر جهانِ خاک و آب — هرزمان باشد رهین اضطراب
"درد و داغ و سوز و ساز و آرزو" — داردش آشفته کار و کو بکو
ناتمامی ها بود سرمایه اش — خام کاری ها بود همسایه اش
این چرا باشد بفهم ای مهربان — آدمی کامل نباشد در جهان
چون سوی دنیای دون مرکب براند — نیمه از ذاتش سر افلاک ماند
پس چنین آشفتگی هایش سزد — چون جدائی ز اندرونش می گزد
این قتیل ناتمامی های خویش — سینه ای دارد ز فرقت ریش ریش
نیمه ای از ذات را می جوید او — راه پیدا نیست و می پوید او

زنده رود

من همی گویم که نیم ذات او — باشد اندر جستجو و آرزو
گر نه جوید، ور نه پوید بر دوام — ناتمامی هاست او را لاکلام!

مقام خطیبِ لبیب

که آزادی خواه کشوراز دست استعمار انگلیسیان بود

مردی دیدم سربلند و خوش خصال — ظاهر از سیمای او حسن جلال
بهره مند از حسن سیمای و صدا — حرف او دارای نیرنگِ نوا
درخطابت با فصاحت کارش بود — هم برآن حسن بلاغت برفزود

درسخن آمد چو آن مردِ رشید گفت او را شد ملاحت ها مزید

خطیبِ لبیب درسخن درمی آید

(پیش از استقلالِ پاکستان)

ای عزیزان، ای جوانان، مردمان بشنوید از من حدیثِ کاروان

سینهٔ من داغ از دستِ فرنگ گلشن مارا ببرد او آب ورنگ

آمده چو سودگر بهر فروش زود برآمد زجان ما خروش

از فریب ومکر وسالوس وریا دام ها بنهاده اندر ملكِ ما

اولاً گیرندهٔ باج وخراج بعدازان غارت گراورنگ وتاج

شاهِ میسور از قتیلان فرنگ یك یك از شاهان ما بگرفته تنگ

حالِ ما بیچارگان اینسان شده فرد فردِ ما غلام شان شده

سالها بگذشت وحال ما چنین حکمرانان کامران ، سرکه جبین

آه ازان روزی که ایشان آمدند بهرِ بربادی چه فرحان آمدند

ای عزیزان ، حال ما ابتر شدست شادئ مابندگان کم تر شدست

آ که زنجیرِ غلامی بشکنیم درس آزادی دگر ازبر کنیم

مقام رهبرِ معظم

بنیان گذارِ کشورِ پاک۱۹۴۷ء

در مقام فرخی چون بارگاه — طلعتی دیدیم روشن همچو ماه
پیرمردی چون جوانان راست قد — در سکوتش صد خروش جزر و مد
دانش سیراب عشق و آگهی — فکر او مبنی بر اثبات خودی
حق شناس و حق شعار و خوش نهاد — در عزیمت کامگار و با مراد
حکمت نورانیان سامان او — دانش افرنگیان حیران او
دید چون مارا همانا خوش سرود — 'زنده رود ای زنده رود ای زنده رود
خوش بیا ای شاعرِ رنگین نوا — خوش بیا ای دیدۀ بینای ما!
ای مسیحای دل رنجور ما — ساقئ میخانه ای لاهور ما!'

زنده رود

قائد من ، رهبر بیدار من — ای تو فوج و لشکر و سالارِ من
خوش نمودی قوم را راه عمل — فکر تو بی اشتباه وبی خلل!

رهبرمعظم مخاطب به زنده رود ترانه سنج می شود

مرا ببین که به ایمای تو چها کردم — جهان تازه پئی قوم خود بنا کردم
پیام شوق گرفتم زموج بادِ سحر — شعاع مهر به خوابیدگان رها کردم
دمیده ام نفس نو به نیستان وجود — سکوت انجمنی را همه صدا کردم

دگر شکسته دلان مصاف هستی را | به محشری که نمی بود ، آشنا کردم
به عقل وعشق کشادم ره شناسائی | بگفته اند که این کار را بجا کردم
به بندگان برساندم پیام دارائی | تومحرم استی که باقوم خود چها کردم

حرکت بسوی فردوسِ شاهان دادگستر ودانشمندان وهنروران نامی وخوش نگر

چون ازین جاپیشتررفتیم، درختان انبوه وپربرگ وبار درنظر جلوه کردکه برشاخهای آن پرندگان خوش منظر آواز می خواندند ، چنانکه گام برداشتیم راهِ عبور پیدا وروشن ترشد

رهبرم گفت این بهشتِ دیگر است | که هزاران رنگ و جلوه در بر است
ماه ها غلطیده روی این زمین | مهر ها چسپیده برهرسنگ بین
عرصه ها و خیمه وخرگاه ها | باغ ها و کاخ ها درگاه ها
دیده های نرگستان بهار | هر قدم گسترده صد طاؤس زار
موج گل از موج گل تا آسمان | برگ گل تابرگ گل صد گلستان"
هر زمان چون گل ز گل برمی دمید | قافله درقافله گل می رسید
کاخ ها از سیمِ خام و زرِّ ناب | سنگ ها چون پاره های ماهتاب
بود این فردوس زیبا و جمیل | از برای پادشاهانِ عدیل

یـــا بـــرای آن گـــروهِ مـفتـخـــر کـز عـلـوم وبـخـردی شد بهره ور
دانـــش افـروزان ز عـلـم و آگـهـی نـقـــش بـنـدان جـمـال زنـدگـی

دیدار با نوشیروان عادل و دستور او بزرگ مهر

تـوی یك کـاخ نـگـارین و بـلـنـد بـر سـریـری بـود شـاه ارجـمـنـد
پـادشـاه پـاك بـین، روشـن ضمیر روی او رخشـنـده چـون مهـر منیر
هم بـه نـزدتخت او تخت دگر لیك بـاوضـع دگـر، رخـت دگـر
جـا گـرفتـه روی آن مرد کریم ســر بســر نـظـارهٔ طبـعِ سـلیـم
رهبرم گفت این شه نوشین روان وان دگـــر دستـور او، آییـن دان

خطاب رهنورد با نوشین روان

گـفتم ای نوشین روان، ای دادگر نـــام تـو روشـن بـه تـاریخ بشـر
عـدل ورزیـدی و داد آمـوختـی خـــرمـن بیـداد را وا سـوختـی
ایـن بهشت از کارخوش انجام تست داد مـی کـردی و ایـن انـعام تست

نوشین روان

عـدل هـم خیراست و شایان شهان پادشاهـی تـن بود ، عدلش روان
عـدل ورزیدن به شاهی افضل است بهره هاگیرد هر آنکو اعدل است
انـدریـن حـالـی کـه مـی بینی مرا اجـرکـارم نیسـت ای حـق آشـنـا
ایـن که می بینی فروغ دیگر است ایـن بهـار از گـفتهٔ آن سرورٌ است

آن شهِ شاهان ، امامِ مرسلان — حاصل هنگامهٔ کون ومکان
سرورٌ و سر دفتر هر دو سرا — هادیان هر زمان را پیشواً
نور پرور در دو عالم، مهر گر — هر چه می گوییم از آن خوب تر
عدلِ آن سردارٌ و شاهٌ دو جهان — اعتبار و آبروی عادلان
عدل آن عادلٌ کجا و من کجا — روح پاکیزه کجا و تن کجا
این فقط یك قطره رحمت است ازان — که مرا بینی به حالی این چنان
قطرهٔ رحمت به از صد آب ها — که رهاند از دو صد گرداب ها
از ظهور آن شهِ عالی جناب — عهد شاهنشاهی ام شد فیضیاب
راویان آورده اند اندر خبر — کان شهِ لولاك، آن والا گهر
روزی از دورانِ من تحسین نمود — عقدهٔ تقدیرِ من از آن کشود
ز انبساطِ خاطرش بر عهدِ من — شد شگفته تر باین جا صد چمن
فضلِ حق دستور من راهم نواخت — تا رفیقم اندرین عالم بساخت!'
گفتم 'ای بوزرّج مهر، ای پند گر — چیست حسن و خوبئ کارِ بشر؟'

بزرگ مهر

ای عزیزان! بهترینِ کارِ ما — حمد بهرِ خالقِ ارض و سما
هر سخن کز مرد حق آگه بود — پُر گُهر از معنی و کوته بود
در هنر مندی بکوش ای بختیار — فرصتِ هستی متاعِ رهگزار
راستی نور است وتاریکی کژی — از کژی داری بسی شرمندگی

رنج بر نایافت از بی دانشی ست / هرچه رفت ازدست از بهر تونیست
دشمن دانا به از یاران خام / می کند یاریِ خامت تلخ کام
هم فروتن باش در آموختن / زیستن در آتش خود سوختن
از همه ناکردنی ها دور باش / هم دلِ مردانِ حق را کم خراش
دل میازاری کسی را، در نگر / از دل آزاری بپرهیز ای پسر
بهره ای دریاب از شائستگی / کار ها پرداز با آهستگی
هم کریمی هم جوانمردی بورز / بارفیقان لطف و دلگرمی بورز
دور باش از کار نسیان وخطا / هیچ گو از حرف های ناسزا
گر کسی پرسد کسی را از هنر / پاسخش دادن نشاید از گهر
علم ودانش را بگیری رهنمون / غیر ازین هرشئی محالست وجنون
از خرد باشد فراغ جسم و جان / بی هنر در کار خود بیند زیان
آدمی باید دلیر و هوشمند / تابود مصئون ز هر گونه گزند

فردوسِ شهیدان درالماس پایه

ودیدار بامظفر خان شهید درماه پایه

زان گذشته راه دیگر یافتیم / منظر از الماس وگوهر یافتیم
از زرناب وگهر ها خاك او / از ستاره ها شده خاشاك او
جائیگاه خوب آمد در نظر / سنگ ها الماس وریزه هاگهر
آب رود و سبزه و بستان و باغ / لاله و گل چون فروزنده چراغ

آن هوا گلگون ز نور سرخ گون — گوی نور افشرده شد از موج خون
آن هجوم لاله و آن سبزه زار — بر بهارش صد بهارِ ما نثار
طائران بالای سر آواز خوان — یا بشاخه های گل بازی کنان
مردمانی چند آنجا در خرام — سبز پوش و مهر چهر وخوش کلام
جائگه دیدیم آنجا خوش نظر — قصری از سیم و زرِ ناب و گُهر
نزد آن رفتیم با شوق زیاد — بر سریری بود مردِ پاك زاد
آن مظفر خان شهیدِ مولتان — سوی ما دید وبگفت 'ای دوستان
خوش بیائید از دیارِ پاك من — هم دیار شاعری، منشی حسّن
مرگ را سامان هستی ساختیم — پس زخون خود بهشتی ساختیم
زیستن در بندگی بدتر ز مرگ — بندگی خود مرگ راسامان و برگ
مولتانّ آن خاك پاكِ محترم — آن دیار مرشدان ذی کرم
مرز و بوم اولیا و اصفیا — آفرین بر آن دیارِ پاك ما
باز گشتی چون ز سیر این جهان — حرف چند از من به ملتان می رسان
گوئی ای ارض کهن ای خوش دیار — گوهری از معدن دیگر بیار
دفترِ پارینهٔ خود باز خوان — باز بنما جوهرِ دیده وران
قرن هارفت وصدای برنخاست — گرچه درمشکیزه ات بحرِ سخاست
ذره ات از مهر ها تابنده تر — خاك تو از کهکشان رخشنده تر
جوهرت را آئنه سامان بکن — دولت ارشاد را ارزان بکن

آن در گنجینه ها را باز کن
روزگار خویش را آغاز کن!

کاخ فردوسی طوسی

کاخ پُر رنگ از زمرد سبز تر — بافروغ و باغ و راغ و بام و در
صحنه هایش پُرگل و پُر رنگ و نور — دیدنش تسکین طبع نا صبور
زیر یك محراب روی تخت زر — جا گرفته مرد پاکیزه گُهر
مرد دیده ور بدستش دفتری — گه گهی میخواند ازان شعر دری
فارسیِ ناب و حرف پهلوی — خواند باصد خوبی و نغمه گری
عظمت اندیشه از رویش عیان — داستان خوان از زمان باستان
شوق بیحد نزد او ما را رساند — او بچندی هم بفکر خود بماند
لب کشاد و صد گلِ معنی بریخت — گوئی در پیمانه ام دریا بریخت
گفت: سازِ زندگانی پُر نواست — نغمه و آواز ها لا انتهاست
یا کسی این ساز را خود کم نواخت — یا هنر کم داشت و برهم نواخت
گفتم ای دستان سرا، شعرآفرین — شاعرِ فرخندۀ ایران زمین
شعر را سرچشمۀ باطن کجاست — یا فقط ذوق نوا، حسن صداست
زندگانی چیست ای روشن ضمیر — چون بباید زندگی کرد ای هژیر

فردوسی

هم باصل طبع و هم ذوق نوا — شعر گردد صورت وحرف وصدا

شعر را با زندگی پیوستگی ست — مصدرِ اصلش ز بطن زندگی ست
شعر را باید بسی علم و هنر — تا بگردد نخل معنی بارور
علم بی پایان و دانش بی کران — شعر را باید به مثلِ پیش خوان
شاعری بی دانش و بی آگهی — دامن مضمون را دارد تهی
دانش و تخئیل و جذب و ابتکار — زین عناصر شعر گردد زرنگار
رنج بردن بهرِتحصیلِ هنر — شرط اول هست گر خواهی ثمر
با همه سرمایهٔ علم وهنر — فضل ایزد بایدت یار، ای پسر!
عمر ها باید کس آرد شعر ناب — پس دگر والله اعلم بالصواب
زندگی منظومهٔ طولانی است — گرچه طولانیست اما فانی است
زندگی حرفست و معنی کار ما — کار بی معنی بود آزار ما
زندگی چون شعرهست از ارتباط — فصل ووصل وربط وضبط و احتیاط
شعر ناموزون متاعِ کس مخر — زندگی بی ربط معنی بی ثمر
زندگی را از مقاصد آبروست — بی مقاصد زندگانی های وهوست
زندگی کارِ بزرگی کردن است — نی زِ نان وآب تن پروردن ست
عقل قندیلست ونورت میدهد — خامه ات را نقش وصورت میدهد
ربط وضبط و فکر وعشق و آرزو — زندگی را زین عناصر آبرو

کاخ و بستانِ شاعر شرق گرای المانوی گوته

(از حیثِ پیکرِ مثالی)

دیدیم آنجا کاخ و بستان و بهار — بر کنارِ آب کاخِ زرنگار

با فروغ لعل و گوهر یافتیم — یك جهان زیبائی را دریافتیم
باغ و بستان پُر گل وپُر برگ و بار — آبجو درموج و کاخ اندر بهار
روی سبزه زیرِ نخل گل نشان — مردی را دیدیم با رطل گران
گه گهی از دفتری میخواند او — چشم بسته درتفکر ماند او
بلبلان را نغمه شد خاطر کشا — نغمه ها خاطر کشا و غم ربا
رهبر من گفت "مرد معنویست — گوته یعنی شاعر المانویست"

ره نورد

ای مفکر، ای ادیب نامدار — ای متاع نازش مغرب دیار
شاعرِ المانوی حکمت نشان — جلوه ها در پردهٔ فکرت نهان
پیروِ حافظ به شعر باختر — ای گزیده شاعر صاحب هنر
فکر را آیینهٔ جان ساختی — برگ را رشك گلستان ساختی
شد اروپا از بهارت گل نگار — شعر تو از فکر تو سرمایه دار
ای اسیرِ شیوه شعر عجم — از کجا این شیوه را کردی بهم؟

شاعر المانوی گوته

شرقیان را گفتگوی دیگراست — این جهان را رنگ و بوی دیگرست
آن مهین شاعرکه حافظ نام اوست — آنکه شعر خاوران را آبروست
شعر نغزش سوز جان افزون کند — گوئی افلاطون را مجنون کند
از می میخانهٔ ایجاد مست — از خمستان ازل بس شاد مست

نقد مستی را بما ارزان کند — سرِّ هستی را بما ارزان کند
شعر مشرق، خاصه شعر فارسی — هست آئینِ جهانِ معنوی
غربیان هم کشف انسان میکنند — شعر را آیینه سامان میکنند
حرف ایشان بیشتر از تن بود — حکمتِ ایشان 'برون دیدن' بود
منکه حرف شوق خوش بنگاشتم — بهره ای از شرقیان هم داشتم
عصرنو از آرزو نا محرم است — بی خبر از سوز و عشقِ آدم است
شورها بالید و نغمه ها خزید — حرف بی معنی ز هر سو می دمید
عصر حاضر را بگو از من سلام — گوئی ای یاران عصر تیز گام
بخت انسان را دگر روشن کنید — خار زاران را دگر گلشن کنید
آدم نو را دگر پیدا کنید — در صدف تاکی، گهر پیدا کنید
آدم نو جوهر آب و گل است — مزرع انسانیت راحاصل است
آدم نو عقل را آموزگار — آدم نو عشق را پروردگار
رازدان پرده های ممکنات — آدم نو آرزوی کائنات
کارِ انسان را دگر آسان کنید — ای عزیزان عشق را ارزان کنید!

فردوس مصور مشرق

آن مصور آن هنرمند جلیل — عهد ما پیدا نکرد او را عدیل
نقش های نو به نو ایجاد کرد — یك جهان نقش ورنگ آباد کرد
آب و رنگ عالم نو آفرید — نغمه ها از رنگ و صورت می شنید

بی ستون عصر را فرهاد بود | مستی اش از بادهٔ ایجاد بود
نغمه را تصویر کرد آن نقشگر | آب را زنجیر کرد آن نقشگر
شرق را پیرایهٔ تمثال داد | رنگ و خط را یك بنای نو نهاد

کاخ مصور مشرق

کاخ او از کاخ های زرنگار | شاهکار از صنعت پروردگار
سقف ومحراب و اطاق مرمرین | سربسر ز آئین فردوس برین
از گل و از برگ گل شبنم چکید | نرمك نرمك باد عنبر بو وزید
طائران بر شاخساران نغمه زن | عندلیبان محو نسرین و سمن
هرگل ناز آفرین جنت فروش | هم صدای قمریان فردوس گوش
گفت زنده رود با آن نقشگر | از تو خاور خنده زن بر باختر
این جوانی از دیار خاوراست | در دلش زنده بهار خاوراست

مصورمشرق

ای جوان ای رهنورد پاك بین | از دیار خویشتن صد گل بچین
رهبر تو رهبرم هم بوده است | این چنین حرفی بسا فرموده است
عقده های ما چه آسان میکشود | زنگ از آیینه های جان ز دود
یك یك از ما دوراو چون جمع بود | ماهمه پروانگان او شمع بود
از کلامش رنگ تمثالان چکید | تا ز کشت خاطرم باغی دمید
گرنه چندی بردرش آسودمی | من نه هرگز این چنین می بودمی

این چنین برشعلۀ جانم فزود — صبح مشرق از گریبانم نمود
من هنر راجان شمردم ای جوان — شرق را رنگین همی کردم عیان
آفرینش دهر را آئین بُد است — آفریدن شیوۀ دیرین بُد است
گر هنرمندی کمی هشیار شو — در گران خوابی، دگر بیدار شو
هر که او بیدار تر رخشنده تر — هر که او خلّاق تر پائنده تر
گر چه من از شرق میدادم نشان — غرب هم دارد متاع سوز جان
باختر از سوز جان در اضطراب — خواهد از خاوردگر زنده کتاب
تا توانی صاحب ادراك شو — شعله ای، رو، شعلۀ بیباك شو!

کاخِ معمارِ تاج

نادرالعصر استاد احمد لاهوری معمارِ شاهجهانی

کم کم از تنویرآن عالم فزود — هر چه پیدا بود رنگ نو نمود
زان جهانی یك جهانِ نو دمید — صد جهان از یك جهان آمد پدید
عالمی پیدا شد از ذوق نمود — کان غبارِ خاطر ما را ربود
عالمی پیدا تر و مشهود تر — از همه موجود ها موجود تر
در فضایش کاخ های مرمرین — با شکوه و رفعتِ چرخِ برین
ایستاده با فروغِ ماهتاب — چون جهانِ خواب درفردوسِ خواب
سنگ های کاخ و ایوان چو گُهر — اسطوان و فرش ها از سیم و زر
دیدم آنجا پیر مردِ خوش نهاد — پاك بین و پاك زاد و با مراد

گفت زنده رود: 'ای مردِ کبیر — ارمغان دوستی از ما پذیر!
ما ز راه عشق اینجا آمدیم — نی که ما بهرِ تماشا آمدیم
گرچه نامت درجهان مشهور نیست — جز به پیدائی ترا منظور نیست
نام تو پنهان و کار تو عیان — چیست این رازی، بگو ای راز دان'

نادر العصر لاهوری

ای فروغِ اختر مشرق زمین — فکر تو آئینۀ هر آن و این
''آدمی اندر جهان هفت رنگ — هرزمان گرم فغان مانند چنگ''
شهرت و گمنامیِ ما در جهان — موجۀ اندیشۀ سود و زیان
آنچه اصل ماست از تخلیق ما ست — بودن و نا بودن از تصدیق ماست
هر که باقی ماند در کار هنر — هست او ارزنده تر، پاینده تر!
گر نهانم، جوهرم پیدا تراست — راز من از راز ها افشا تراست
از ضمیر من پذیرفته نشان — شوکت معمارئ تیموریان
تاج ، آن گنجینۀ نور هنر — تاج ، آن ناظورۀ اهلِ نظر
تاج ، آن تجسیمِ خوابِ مرمرین — یعنی آن نقشِ بهارِ گوهرین
نغمه ای از سنگ بیرون آمده — شعله ای از رنگ بیرون آمده
رفعت و بهجت بهم آمیخته — رنگ ها از ساغرِ جان ریخته
بر دوامِ کارِ مشتاقان دلیل — تاج ، آن نیرنگئ حسنِ جلیل
مدتی در طبعِ بیتابم خلید — تا مثالِ اشك از چشمم چکید

سنگ را ذوقِ بهاران از منست / این زرِ تاجِ نگاران از منست
شاعری در خشتها ورزیده ام / از شرارِ سنگ گلها چیده ام
عشق آن شاهِ جهان، آن تاجدار / درجهان از دستِ من شد آشکار
عشق شاهان بی هنر، بی قیمتست / از هنرمندان بقای دولتست
عشقِ من هم عشق و هم ذوقِ هنر / عشقِ من هم جهد و هم شانِ بشر
عشق هم معنی و هم صورت بود / عشق هم رنگست وهم هیئت بود
شاعری باشد که انواع هنر / از ضمیرِ خویش می آرد بشر
در ضمیر آدمی اعصارها / حال واستقبال واستمرارها
در مرورِ روزگاران آدمی / قدر یابد از شعور زندگی
این شعورِ زندگی معنی بود / کارِ بی معنی گر انجانی بود
در هنر زائیدن اصل زیستن / خویش را در کارِ خود نگریستن
ابتکار واجتهاد و اختراع / ناگزیرِ ارتقا و ارتفاع
در هنر پیدائی اصل شهرتست / بهتر از نام و نگین این دولتست

روح میرزا بیدل نمودار می شود

لمعه ای رخشید و برق طور شد / هر چه می بود از نظر مستور شد
صورتی پیدا شد از طغیان نور / آنکه بودی گنج معنی را ظهور
میرزا بیدل ز دور شه جهان / حرف و معنی را نشاط جاودان

میرزا بیدل غزل می سراید

دوستان! افسرد دل، چندی بآهش خون کنید
کم تلاشی نیست اگر این سکته را موزون کنید
زندگی را صفحۀ انشای قدرت کرده اند
تا نفس پر می زند تفسیرِ کاف و نون کنید
هر چه دارد عالم اخلاق ، بی ایثار نیست
دست بسیار است اگر از آستین بیرون کنید
قیدِ گردون ننگ دانائیست اگر فهمد کسی
خویش را از خُم برون آرید و افلاطون کنید

ره نورد

ای ز فکر خود بهار گل بدوش باز گو از رنگِ محفلهای دوش

بیدل

ای خیال آوارۀ نیرنگ هوش تا توانی درشکستِ رنگ کوش

ره نورد

صد گل از باغ جهان برچیده ای هیچ از کُنهِ جهان فهمیده ای؟

بیدل

چون تپش درد نفس دزدیده ام موجم اما در گُهر لغزیده ام
مستی ام از مشرب مینا گریست هرقدر بالیده ام، کاهیده ام

حیرتم آئینۀ تحقیق نیست　　این قدر دانم که چیزی دیده ام

ره نورد

در دلِ انسان چنین تشویش چیست؟　　حاصل این کاوشِ تحقیق چیست؟

بیدل

سخت بی رنگست نقش مدّعا　　عالمی تصویر عنقا می کشد

محفلِ رنگ از شکستن بسته اند　　بسکه بارد درد دلها می کشد

ره نورد

تو ز پیدائی سخن گفتی چه سود؟　　گوهراز تار نفس سُفتی چه سود؟

بیدل

معنیِ هستی گراست اینست وبس　　زندگی را دید آئینست و بس!

شوقِ پیدائی ز خود بر چیدنست　　درطوافِ خویشتن گردیدنست

عالم افسونست و ما حیرت فروش　　نا رسائی ها دم عشرت فروش

کوه گشتن کاه بودن همبرست　　تا تو پیدائی جهان پیداترست

حاصلِ تحقیق ها جز آه نیست　　جز به بی سوئی دویدن راه نیست

عکس در آئینۀ هوش اوفتاد　　تا بنای بزم رنگ و بو نهاد

درتجلی گه که عالم نام اوست　　آنکه پیدا نیست پیدا کو بکوست

نقش را حرفی بدان زان پس شنو　　خویش را منزل شمر زان پس برو

حرف و معنی از تو گیرد ارتباط — از تو ضِدّین جهان را اختلاط
دیده و نادیده را مشهود دان — حال واستقبال را موجود دان!

کاخ مرزا غالب دهلوی

پیش می رفتیم و میدیدیم دور — بر کنار آب کاخی پر ز نور
کاخ را صد صحنه و محراب بود — زینه پائین رفته زیرِ آب بود
نزد آن زینه بدیدم تخت عاج — روی آن بنشسته مرد خوشمزاج
پیر مردی خوش نهاد و نغز گو — هم سخن ها خوش بگفته آن نکو
دفتری زرّین رقم دردست داشت — گه ازان میخواند وگاهی خوش نگاشت
من بدل گفتم که مرد جالبست — خوب بشناسم که مرزاغالب است
گفتم ای مسند نشین شاعری — ای شناسای دری و فارسی
شعر گفتی خوب تر از لعلِ ناب — روی معنی رانمودی بی نقاب
ای ترا الهامِ معنی ساز گار — از تو باغ شاعری را نو بهار
حرف کی باشد ز معنی فیضیاب — چون توان گفت آنچه ناید در خطاب

غالب

حرف را از خون دل باید گداز — از حقیقت باشد آن یا از مجاز
حرف ها بی سوز و ساز آرزو — مثلِ نخلِ برگ ریزان بی نمو
ای عزیزان قطره را جیحون کنید — درتلاش حرف دلها خون کنید
شاعری کیف جهان معنویست — شاعری هم جزوی از پیغمبریست

حـرف را بـامـعـنـی اش پیـوسـتـه دار
تـا بـگـیـری از گـلـی صـد نـوبهـار!

چراغِ مقبلی

احوالِ زنِ پیر که هر شب چراغی در کوچه ای بر افروخت

در مـژه بـرهـم زدن تـاخیر شد — عـالـمـی در عـالـمی تغییر شد
گفت رهبر ایـن فروغِ باغ و راغ — گـوئـی از خـم خـانه ها باشد ایاغ
ایـن تـجـلـی ها نمودار جزا است — این حیاتِ دائمی لطف و عطاست
مردمان در خـون دل آغشته اند — تـا سـزاوارِ عـنـایـت گشتـه اند
ایـن هـمـه از نـامداران نیستند — نـامـور چـون تاجداران نیستند
نیـکـوئـی را شهرتی منظور نیست — هر یـکی زینها چنین مشهور نیست
ای بسـا اهلِ بهشـت اندر جهان — زنـدگـی کـردند بی نام و نشان
لیك در عـقـبـیٰ جـزای یـافتـنـد — یـافتند آن را که خود می ساختند
این چنین گفت و فضای آن جهان — گشـت معـمـور از ضیای لا زمان
لـمـعـه لـمـعـه بـرقِ طور آثار شد — ذره ذره مـصـدرِ انـوار شـد
نـور فـوق و نـور تـحـت و نور پیش — نـور را نـورِ دگـر مـی کـرد بیـش
آن نـمـود نـور و آن نـورِ شهـود — حیـرت انـدر حیـرتم در دل فـزود
گفت رهبر 'اینکه یك صد تا شد ست — از چـراغِ مـقـبـلـی پیـدا شـدسـت
آنـکـه دور از مـا نشانِ خانه ایست — بـانـوی را گـوهـرین کاشانه ایست

آنکه اندر آن مکان آسوده است | یك زنِ بیوه بعالم بوده است
در جهان اور را کسی محرم نبود | از عزیزان هیچ کس همدم نبود
غیر از بی چارگی چیزی نداشت | از متاعِ زندگی چیزی نداشت
کس نبودی سامعِ گفتارِ او | کس نبودی در مرض تیمارِ او
لیك با آن پیری و بی چارگی | آن زنِ خیر آشنا در مفلسی
در مرورِ زندگانی هر شبی | یکچراغ افروخت اندر کوچه ای
آن تنك مایه چراغِ رهگذر | رهروان را بود همچون راهبر
این همه نوری که بر گردیده است | از چراغ کوچه ای بالیده است
ذره ای از خیر هم بی مایه نیست | گر قبول افتد دوامِ دولتیست
ای خوش آن کاری که شد پاینده تر | در بها افزون تر و ارزنده تر
شیخِ من این گفت و از ذوق حضور | سو بسو دیدم بهارِ رنگ و نور
لجّهٔ انوار و موجِ رنگ و بو | هر زمان شد روبروی و تو به تو
نور ها بالید و هم نوری فزود | موجه ای صد موجه را راهی نمود
آن زمین از نور و آن پهنای نور | دور تر دیدم یکی دریای نور
گفت رهبر خوش بیا کانجا رویم | خوش بیا تا بر لبِ دریا رویم

دریای نور

خوش بیا ای ساقی دولت مدار | رونما از تاك بستان بهار
تشنگان راقطرهٔ صهبا ببخش | قطره را سیرابی دریا ببخش

فرش گل راتخت و گل را تاج کن / آبجوئی را دگر موّاج کن
جلوه هاارزان بکن با خاصگان / نکته هاتعلیم کن باعاقلان
مستیِ خود عام کن باخواب بخت / عشق را ارزان بکن سامان ورخت
باز رو آرم بسوی گفت خویش / خواهم ازتو همت مردان کیش
اندران دنیای بالیده ز نور / بود صد گونه تجلی را ظهور
جلوۀ نو آمده از دور دست / رهبر من گفت: 'آبِ نورهست'
گام زن رفتیم نزد آبِ نور / بر کنارش نخلها شادابِ نور
کشتئ زرّین برآمد بر کنار / بهر ما آماده و در انتظار
رهبرم گفت:'ای عزیز نیك بین / خوش بیای و بر سر کشتی نشین'
با یقین و بی گمان و بی خطر / جا گرفتم اندران کشتیِ زر
در هوای سیمگون و خوشگوار / کشتی زر شد روان بی اختیار
باد عنبر بو وزید و نور گشت / رنگهای نو دمید و نور گشت
در هوا صد طائران آواز خوان / موجه های آب گوی گلفشان
طبع را ذوقی ببخشید آن فراغ / مست گشتم بی شراب و بی ایاغ
در هوای روشن و هم مشکبار / صد خیالم رنگ بسته چون بهار
چهره برافروخت صد مینای نور / نقشها می ریخت از ین دنیای نور
عکس در عکس و جهان اندر جهان / نقشها و رنگها گشته عیان
نغمه ها بی ساز و بی تارسرود / از پس این نقشها صورت نمود
حسن را دیدم چسان صورت شود / درد را دیدم که چون راحت شود

فکر کی می بالد ومعنٰی شود — حرف از تمثال کی پیدا شود
نیك فهمیدم ز رمز شاعری — خوب سنجیدم مقام آگهی
حرف را باحرف پیوستن چسان — رنگها با رنگها بستن چسان
علم کی گردد امام شش جهات — عشق کی گیرد زمام کائنات
این همه یك ساعت فیضان ببود — کاندران صد جلوهٔ معنی نمود
آن سوی دریا کنار جانفزا — آن زمینِ گلنشان و آن هوا
کشتی را بگزاشته بر ساحلی — راه پیمودیم سوی منزلی

کاخ گل نشان و دختر ماه وش

کاخی گل پوش و گل افزای بهار — اندرون و هم برونش زرنگار
در چمنزاری بدیدم دختری — دختری ناز آفرینی دلبری
آن سیه چشمان بکار ساحری — با زر ناب تننش چون سامری
آن دو زلفش دو کمند هوش و جان — وان رخ چون ماهِ اوبس جانستان
آن بهاری هست زیر آسمان — وان نگار صد نگاران جهان
با کف و دامن بهار گلفروش — درتکلم آمد و رفتم ز هوش
گفت با صد شیوهٔ جادوگری — 'منتظر هستم پئی آن پیکری
کاندران دنیای آب و خاك ورنگ — برکند از بیخ ریشه های جنگ
عشق را سرمایهٔ آدم کند — هر بنای ظلم را برهم زند
مردمان را یار یك دیگر کند — دوستان را رشتهٔ گوهر کند

دوزخ دنیا که نفرت نام اوست　　آدمی را تلخ کامی ها ازوست
آن جهنم را دگر گلشن کند　　یك بنای تازه در عالم نهد'

گفتار زنده رود

رهبرم گفت ای هنرمند جوان　　من درین سیری ترادادم نشان
از جمال فکر مردان جلیل　　تاکه فکر تو نه باشد بی دلیل
این همه مردان پاکیزه سرشت　　این همه مردان که بینی دربهشت
زندگی را جهد پیهم ساختند　　نقد جان را گاه هم در باختند
چون بگردی باز سوی آن جهان　　قوم خود را می دهی زیشان نشان
قوم را گوئی که ای یاران من　　کشت و ابر و دانه و باران من!
ای جفا بینندگان روزگار　　تا بکی باشید رهن روزگار
تا بکی تقلید آن نا محرمان　　یعنی آن افرنگیان و غربیان
باختر محو فروغ تن هنوز　　فکر او غوغای 'ما و من' هنوز
خویش را از بی خودی پیدا کنید　　محشری از بانگ خود برپا کنید
ای سفیری از دیار پاك من　　ای شرارِ شعلۀ ادراك من
فکر بی باك مرا دمساز کن
سوز و ساز سینه ام هم راز کن!

دیدار با سعدی شیرازی درباغ دانش

خوش بیا ای ساقی فرخنده پی　　بادۀ دوشینه آر از روم وری

جرعه ای از بادۀ شیراز ده / آن مئ سعدی و حافظ بازده
ساقیا! آن ساغر زرّینه آر / وان شراب حکمت دیرینه آر
مهربانا! بادۀ اشراق ده / ساغری از شیشۀ اخلاق ده
در یکی از باغ های بی خزان / پیر مردی را بدیدم ناگهان
آن معلم، آن مفکر، آن ادیب / سعدیِ شیرازی دولت نصیب
دست من بگرفت آن والا تبار / گفت: 'می بینی شئون کردگار
از نیاگان پند و موعظت بگیر / وز همه پیش آمده عبرت بگیر
خلق را بارعمل بردوش بین / هر چه می بینی ز چشم هوش بین

چند پند از سعدی

تا توانی راستی را دوست دار / آدمی باش، آدمی را دوست دار
پردۀ بیگانگی را چاك کن / خاطرت از گرد نفرت پاك کن
آفرین گو هر که او خیری کند / آفرین گو گرچه آن غیری کند
ای عزیزان از جهان آب وگل / آدمی باید بود دارای دل
دل که آن را مایه از عشق و وفاست / دل که آن پروردۀ ذوق عطاست
در مرور قرنها نوع بشر / صد جفا دیده ز دست یکدگر
گاه در تعمیر اهرام بلند / خوارگشت این نوع و دیده صدگزند
گاه صد ها سال اندر بندگی / آدمی را چیر گشته آدمی
رست خیز جنگهای امتان / خون عالم ریخته اندر جهان

موقعی آمد که این نوع بشر — باز گردد از سعادت بهرور
گو که حرف خوش نمی گردد تمام — پس سخن کوتاه باشد والسلام!'

پیش ما آمد جهان نوپدید

پیش ما آمد جهان نو پدید — جاده هم تا می توان آنجا رسید
خستگی و ماندگی آنجا نبود — انبساط ما به هر گامی فزود
آن زمین زرنگار و گل بدوش — از گیاه نوع دیگر سبز پوش
کنج کنج باغ صد کاشانه گل — شاخ شاخ تاك صد خمخانه مُل
طوطیان گنج نوا در باخته — بلبلان صد زمزمه پرداخته
دیدم آنجا بارگاه ارجمند — با رواق سیم و با بام بلند
نخل های گل بدامان زر بکف — سایها گسترده آنجا هر طرف
در پس او موج جوی سیم ناب — بر کنارش جلوه های ماهتاب
آن بنای خرم و آن کاخ نور — مهر پرور ماه گر چون برق طور
از درونش یك نوای دلفریب — می ربود از ما سروبرگ شکیب
گفتم اینها از کدامی ساز هست — گفته شد این بلبل شیراز هست

ترانهٔ بلبل شیراز حافظ شیرازی

"حاصل کارگهِ کون و مکان این همه نیست
باده پیش آر که اسباب جهان اینهمه نیست
از دل و جان شرف صحبت جانان غرض است
همه آنست وگرنه دل و جان این همه نیست

دولت آنست که بی خون دل آید بکنار
ورنه با سعی امل باغ جنان اینهمه نیست
نام حافظ رقم نیك پذیرفت ولی
پیش رندان رقمِ سود وزیان اینهمه نیست"

منکه اندر جستجوی بوده ام — رهگرای سوبسوی بوده ام
چون صدای حافظم آمد بگوش — آرزویم گفت بامن: هان بکوش
رهبرم ایمای من فهمید خوش — برجبینش لمعه ای رخشید خوش
گفت آن دانش شعار پاك باز — 'حافظ اسرار، آن دانای راز!
گو بظاهر از گل و گلزار گفت — هر چه گفت از مخزن اسرار گفت
آن مهین شاعر که حرفِ ناب گفت — تو مپنداری حدیث خواب گفت
آن امام شاعران خاوران — آن دل وچشم و روان خاوران
درسخن رمز آفرین، نکته شناس — هر نوای ساز او معنی اساس'

ره نورد

مرحبا ای شاعر فرخنده فال — آفرین ای خسرو شیرین مقال
در غزل هر کس ز تو الهام گیر — ای به افلاك سخن مهر منیر
ای سرورِ جان مشتاقانِ فن — ای روان شاعری، ای جان فن
اکتساب از رندی و مستیِ تو — کرده و رقصان شده ارباب هو
شعر تو از بسکه مستی آورد — هوشمندی، بخردی ها ناورد
سکر ومستی شیوهٔ دیوانگی ست — کی توان گفتن که این فرزانگیست؟

حافظ شیراز درجذب و مستی میگوید

خوش بیا ای ساقیِ زرّینه جام — تا ز کشت جانِ ما روید کلام
ساقیا آن بادهٔ صافی بیار — تا نگردد جامهٔ جان تارتار
ساغری از رنگ مینای صفات — ساغری از کیف صهبای حیات
باده ای از تاك میثاق آر زود — باده ای چون نور بی زنگار دود
خواب را باذوق هستی رشته ایست — جان شیرین را به مستی رشته ایست
نور و ظلمت روز و شب پست و بلند — زوج زوج است ای عزیز ارجمند
هوش و مستی زوج یکدیگر بود — کس ز یك کمتر نه کس بهتربود
سکر تنها همدم بی دست و پاست — عقل تنها رهبر کم آشنا ست
ای اسیر هوش در تعدیل کوش — هوش هم بی سکر و مستی بار دوش
زیرکی افزود و بیداری نماند — هوش ها کاهید و هشیاری نماند
امتان هر زمان در اعتدال — کامگاری یافتند اندر کمال
آگهی گرچه بود اصلِ اصول — بیخودی لیکن بود باب وصول
'جهد کن در بیخودی خود را بیاب — زود تر، والله اعلم بالصواب'

گفتار زنده رود

گفت بامن رهبر شیرین سخن — خوش برواکنون وهمت ساز کن
استعانت خوانی از ربّ کریم — مهربان است ورحیم است وکریم
کی توان بی فضل اورفتن براه — از خدا هم راه وهم همت بخواه

کس نداند کار ما روحانیان ما و این عالم همه سرّ نهان
سیر تو هر چند سیر واقعیست کار تو لیکن ز اسرار خودیست
اینکه می بینی برنگ این وآن از مقامات شعور خویش دان
خویشتن تا خویشتن هم عالمست انفس و آفاق رازِ آدم است
چون شعور ذات میخواهد نمود خویش را بیند چو امکان وجود
درعموم این اصل سیر معنویست انتهای آدمی هم آدمیست
سیرِ انفس هم ز توفیق خداست آنکه بر افلاك می آید کجاست
هم کرم میدان که در وهم و خیال آمدی این سوی فردوس جمال
انفس و آفاق درمعنی یکیست غیب یك عالم شهود دیگریست
بزم امکان رمز امکانات هست آدمی را شرط جهد ذات هست

دفعةً آن وادی ای آمد پدید

دفعةً آن وادی ای آمد پدید کز نمودش شوق من گشته مزید
وادی ای از حرفها آراسته حرفها چون نخلها پیراسته
حرف نخل وحرف برگ و حرف بار ای خوشا این وادئ معنی بهار
گفت در گوشم یکی گوینده ای 'ماهمی جوئیم کو یابنده ای
هر که او جوید بیابد ای مرید بی مراد است آنکه گردد نا امید
درطواسینی تو ای حیرت فروش مورد فضل خداوندی بکوش!'
ناگهان دیدم جمال جانشکار اندران طاسین گشته آشکار

خوش درخشان بود مهرِ معنوی — آن جلال الدینِ ما آن مولوئ
مولویِ معنویِ پاك زاد — نکته دانان را گزیده اوستاد
مرشدِ اقبال و جمله عاشقان — رهبرِ ربّانیانِ شرقیان
چون مرا دید از ره لطف و کرم — خوش تبسم کرد وگفت آن محترم
'دوست دارد دوست این آشفتگی — کوشش بیهوده به از خفتگی!'

دعای رومی برای سعادت بشر بر زمین

'ایخدا! ای قادر بی چند و چون — واقفی بر حال بیرون و درون
ای خدا ای فضل تو حاجت روا — با تو یاد هیچ کس نبود روا
این قدر ارشاد تو بخشیده ای — تا بدین بس عیبها پوشیده ای
قطرهٔ دانش که بخشیدی ز پیش — متصل گردان ز دریا های خویش
''ای خدا بنما تو جان را آن مقام — کاندرو بی حرف می روید کلام''
قادرا! قدرت تو دادی بر کمال — انت ربی انت حسبی ذوالجلال
از عدم دادی بهشت ارتقا — زان سپس ایمان و نور و اهتدا
اینکه شکر نعمت تو می کنم — این هم از تو نعمتی شد مغتنم
شکر این شکر از کجا آرم بجا
من کیم از تست توفیق ای خدا'

ای خدا! اندر جهان آب و خاك — فکر انسان گشت از نیکوئی پاك
'چونکه بیرنگی اسیر رنگ شد — آدمی با آدمی در جنگ شد'
صورت آدم شد از معنی تهی — وای بر تقدیر نوع آدمی

از ضمیرش نور ایمان رفت، حیف
جوهر انسان ز انسان رفت، حیف!

عشق رفت از دل هوس باقی بماند
میکده ویران شد و ساقی نماند

حرمتِ آن رشته و پیوند نیست
هیچ کس اندر جهان خورسندنیست

آدمی بدبین شد است و نا صبور
آدمی دارد که گردد بی شعور

آدمی دارد که نا آدم شود
جوهر او از عناصر کم شود!

ای خدا ای صاحب جود و عطا
ای تجلی گاه تو فردوس ما

قدرتت از هر دو عالم آشکار
جز بفضل تو نباشد هیچ کار

بیکسان بیچارگان را دستگیر
این دعای نیك را از من پذیر

نا توانا را توان ارزان بکن
مشکل نوع بشر آسان بکن

آن گل تنها بدشت ممکنات
آن چراغ آگهی درشش جهات

گوهر یکدانه از کان وجود
آن زر خالص بدامان وجود

آن گلی را برگ ریزان را مده
آن چراغی را بطوفانان مده

آن گهر را در عدم پنهان مکن
دولتش را این قدر ارزان مکن

عقل راسرمایهٔ آدم بساز
از شرار عشق جانش را گداز

باز او را صاحب ایام کن
کار او را فرخی فرجام کن

رهنورد

این سخن را نیست پایان دوستان
کاندرین رَهْ نیست منزل را نشان

لا نهایت را نباشد اختتام
چونکه باشد این دوام اندر دوام

گفت رهبر: 'رهنورد زنده دل ساز کن رختت ازینجا خوش بهل
باز رو سوی جهان آب و نان باز جو از دوستانِ خود نشان'
صبحدم بیدار گشتم من ز خواب بر سرم برآمده بود آفتاب
روز نو روشن شده از پیش بیش کارهای روز و شب دیدم به پیش
مرحبا ای دوستان خنده رو باز می بینم جهان چار سو
باز یاد آرم نگاران جهان ای خوشاروزی به بزم دوستان!

به اتمام رسید مثنوی فرخنامه مصنفه دکتراسلم انصاری

(ملتان۔ پاکستان)

8 فروری 2020ء